إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مارچ ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

تشویش

فروری ۲۰۱۲ء کا البرہان دیکھ کر بعض احباب نے اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ پرچہ سیاسی ہو گیا ہے اور ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں نہیں پتہ تھا کہ آپ کے اندر ایک سیاستدان بھی چھپا ہوا ہے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ البرہان کی بنیادی ترجیح اسلامی تناظر میں تعلیم و تعلم، تربیت و تزکیہ اور اسلام و مغرب ہی ہیں لیکن اسلام چونکہ ایک دین ہے لہٰذا وہ زندگی کے سارے شعبوں اور مسائل سے بحث کرتا ہے اور زندگی چونکہ ایک وحدت ہے اس لیے سارے شعبہ ہائے حیات ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ سیاست بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کرتا ہے اس لیے نظری مباحث میں اس کا کبھی کبھار در آنا ممکن ہے۔ ظاہر ہے سیاست اور سیاستدان اگر سیکولر ہو جائیں تو اس کے اثرات لازماً نظام تعلیم و تربیت پر بھی پڑیں گے اور فرد کی ذہن سازی کا منہاج بھی اس سے متاثر ہوگا۔ اس لیے بعض اوقات اس پر بات کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے لہٰذا ہم اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے ___ تاہم یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے۔ آج اگر عمران خاں یا جماعت اسلامی کا ذکر البرہان میں اس حوالے سے ہو رہا ہے کہ ان کی پالیسیاں پاکستان کی دینی، تہذیبی، علمی، تعلیمی اور اخلاقی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہونے والی ہیں تو ممکن ہے اگلے کئی شماروں میں ان کا ذکر ہی نہ ہو۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر منیر احمد خان☆

مثالی نظامِ تعلیم کی تشکیل ۔سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں

'یرفع اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت'(۱)

اللہ تمہارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا، درجے بڑھائے گا۔

ایک اور مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآنِ حکیم میں یوں بیان کی گئی:

'ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم ط انک انت العزیز الحکیم'(۲)

اے ہمارے ربّ! ان (اہلِ مکہ) ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان پر تیری آیات تلاوت کرے اور اُن کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان (کے نفس) کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبیٔ آخرالزماں حضرت محمدؐ کی بعثت کا مقصد لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دینا اور ان کے نفس کا تزکیہ کرنا تھا۔ پس جو لوگ ان دونوں منزلوں سے گزریں انہیں ''بلند تر درجات'' کی نوید سنائی گئی ہے۔ آنحضرتؐ کو جس مثالی نظامِ تعلیم کی تشکیل کا فریضہ سونپا گیا اس کے دو حصے یا جز ہیں:

(الف) کتاب و حکمت کی تعلیم (ب) تزکیۂ نفس۔ہم ان اجزاء کو مزید تفصیل سے یوں بیان کریں گے۔

اوّل: (الف) دینی تعلیم (قرآن وسنت) (ب) دنیاوی تعلیم

تزکیۂ نفس (اخلاقی تربیت)

دوم: (الف) ظاہری تربیت (ڈسپلن) (ب) روحانی تربیت

جزوِاوّل میں دینی تعلیم سے مراد ہے قرآن وسنت، فقہ، اصول حدیث وغیرہ سے کماحقہٗ آگاہی اور دنیاوی تعلیم سے وہی پیشہ ورانہ تعلیم مقصود ہے جو آج کل دنیا بھر کے مدرسوں میں مروّج ومرجّح ہے۔ جزو ثانی میں ظاہری تربیت یا ڈسپلن سے مراد وہ نظام تربیت ہے جس کے ذریعہ فرد یا طالبِ علم کو تمام اہم جسمانی قواعد سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس تربیت کا مقصد طالبِ علم کی ہمہ جہتی جسمانی نشوونما مطلوب ہوتی ہے۔ جزو ثانی کی دوسری اہم جہت روحانی تربیت ہے جسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں

☆ صدر شعبہ اسلامی کلچر، یونیورسٹی آف سندھ

تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔

حضور اکرمؐ نے ایمان قبول کرتے ہی صحابۂ کرام سے بیعت کا جو نظام وضع کیا وہ دراصل نظامِ تعلیم کا اولین نقش تھا۔ صحابہ کرامؓ، آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو گویا ان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا آغاز ہو جاتا۔ پھر اصحاب صُفّہ کی ذہنی و روحانی تعلیم و تربیت کا تو خصوصی بندوبست کیا گیا۔ انسانی کمال یہ ہے کہ اس کے نفس کی خوبیاں ترقی کریں اور جو برائی اور عیب خصلت و مزاج میں واقع ہو، وہ خوبیوں سے بدل جائے، یہ کمال صرف اخلاق ہی کے ذریعے میسر آ سکتا ہے۔ اخلاق کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ اس کی بنیاد چار چیزوں پر ہے:

(۱) حکمت (۲) شجاعت (۳) عفّت (۴) عدالت

حکمت کی تعریف یہ ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں ان کی حقیقت اور اصلیت کو جاننا اور سمجھنا۔ اس عرفان کے لیے جو خصوصیات لازم سمجھی جاتی ہیں ان میں ذکاء، سرعتِ فہم اور صفائے ذہن وغیرہ اہم ہیں۔ شجاعت یہ ہے کہ جب کبھی کارِ خیر یا دین کے خلاف کسی خبر یا واقعہ کا علم ہو تو طبیعت بے چین ہو جائے اور شر کے سدِّ باب کی کوشش و جستجو کرے۔ عفّت سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی بری خواہشات کو اتنا دبائے کہ وہ اس کے قابو میں آ جائیں۔ جب طبیعت میں یہ ملکہ پیدا ہو جائے تو حیا، صبر، قناعت، سخا اور حرّیت جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ عدالت کی صفت (۱) حکمت (۲) شجاعت (۳) عفّت میں ہم آہنگی کا نام ہے۔ عدالت کی خوبیوں میں صداقت، وفا، صلۂ رحم، تسلیم و رضا اور توکّل و شکر نمایاں ہیں۔

اصحاب رسولؐ کی تربیت کے لوازمات میں مندرجہ بالا خصوصیات عموماً اور اور اصحابِ صُفّہؓ کی تعلیم و تربیت میں یہ عناصر بہ درجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہی صحیح اسلامی تربیت کا نظام ہے جس کا ایک پہلو جسمانی تعلیم اور ضروریات دنیوی کا احاطہ کیے ہوئے تو دوسرا پہلو دینی شغف اور روحانی ترقی اور اسراع کا ضامن ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم صحیح نہیں؟ اگر صحیح نہیں تو کس قسم کا نظامِ تعلیم پاکستان کی مثالی ضرورت کے مطابق ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ نظامِ تعلیم پر مختصر نظر ڈالیں اور ان حالات کا جائزہ لیں جن کے ماتحت یہ نظامِ تعلیم ہمیں ملا۔ اس سوال کا جواب پروفیسر حمید احمد خان کی تحریر میں دیکھتے ہیں وہ فرماتے ہیں: ''یہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۷۶۵ء میں جب مغل شہنشاہ شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کی تو تمام انتظامی اختیارات کمپنی کے سپرد ہو جانے کے باوجود دفتری زبان ازروئے معاہدہ فارسی ہی رہی اور درسی زبان کی حیثیت سے بھی فارسی کا وہ منصب بدستور قائم رہا جو اسے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں حاصل تھا۔ سولہ برس بعد ۱۷۸۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہمارے نظامِ تعلیم میں پہلی بار ہمدردانہ دلچسپی لی۔ اس سال

وارن ہیسٹنگز نے عربی اور فارسی میں ہمارے قومی اور علم وادب کی تعلیم کے لیے کلکتے میں مدرسہ قائم کیا اور اس کے بعد چند سال تک ہمارا نظامِ تعلیم انگریزی اعانت سے ہماری روایات کے مطابق کام کرتا رہا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں یہ کوشش کی گئی کہ مسلمانانِ ہند کو اردو کے ذریعے مغربی علوم کی واقفیت بھی بہم پہنچائی جائے، لیکن پھر انگریز حکام کے دل میں بتدریج ایک اور خیال پیدا ہوا جس کا پہلا تحریری سراغ ۱۸۲۴ء کے ایک سرکاری مراسلے میں ملتا ہے۔ وہ خیال یہ تھا کہ اہلِ پاکستان و ہند اپنے قدیم علوم سے قطع نظر کریں، صرف یورپی علوم پڑھیں اور ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی مشہور سرکاری قرارداد نے اس نئی تجویز کو قطعی صورت دے دی۔ یہ نیا طریقِ تعلیم جس میں اہلِ پاکستان و ہند کے لیے ذریعہ تعلیم بھی بدل دیا گیا۔ انگریز حکام نے خاصے غور وفکر کے بعد اختیار کیا تھا اور اس عمل کے بعض دوررس نتائج اُن کے پیش نظر تھے۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر اس برِّاعظم میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک ایسا اقلیتی طبقہ پیدا کرنا مقصود تھا جو (میکالے کے الفاظ میں) ''ہمارے کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان، جس پر ہم حکمران ہیں، ترجمان بن جائیں ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات، اخلاق اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہوں''۔ یہ ہے ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی مختصر تعریف۔ (۳)

اس بیان کی روشنی میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انگریز ہم سے کس قدر تعصب رکھتا ہے کہ ہماری طلبہ کے ذہن وعقل کو انگریز بنانا چاہتا ہے تاکہ ہمارے اخلاقی حالت بھی ابتر ہو جائے اور ہم کہیں کے نہ رہیں۔ بیشک وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن وہ ہمیں انگریز نہ بنا سکے مگر ہمارا ایک ایسا عظیم نقصان ہوا جس کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کہتے ہیں کہ ''ہم اس عظیم علمی اور تہذیبی ورثے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا۔ اُس سے بھی بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہمیں اپنے قومی علمی سرمائے پر جو فخر وناز تھا، اسے ہماری موجودہ تعلیم نے فنا کر دیا۔ ہم مہتم بالشان تاریخی روایات کے وارث ہیں اور یہ روایات ہمارے اپنے علوم کے ساتھ وابستہ تھیں۔ عربی اور فارسی سے ہماری بے تعلقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ان علمی خزائن سے محروم ہو گئے جو ان زبانوں میں محفوظ تھے۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ انگریزی زبان وادب اور مغربی علوم سے جو بیشمار فائدے ہمیں پہنچے ان کا انکار کروں لیکن ظاہر ہے کہ اپنی قومی روایات سے منقطع ہوئے بغیر بھی ہم یہ فائدے اٹھا سکتے تھے۔ شکایت یہ ہے، اور بجا شکایت ہے، کہ ہماری تعلیم کے لیے ایسا ذریعہ اختیار کیا گیا جو ہماری غیرتِ قومی کے منافی تھا جس نے ہمیں ہمارے ماضی سے کاٹ کر الگ رکھ دیا اور تاریخ کے علمی تسلسل کو برباد کر دیا۔ لیکن ماضی سے قطع نظر اس ذریعۂ تعلیم نے موجودہ دور میں بھی ہماری فکر واظہار کی قوتوں کو سلب کر لیا کہ ہم عقلی طور پر ناکارہ ہو گئے اور ہمارا شمار تیسرے درجہ کی قوموں میں ہونے لگا۔'' (۴)

اگر ہمارا ذریعۂ تعلیم ہماری قومی زبان اور فارسی، عربی اور انگریزی میں ہوتا تو ہم زیادہ ترقی کرتے

اور بہتر طریقے سے ہر چیز کو سمجھتے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا کر بھی ہم انگریزی میں کوئی کارنامہ نہیں دکھا سکے۔ بہر حال اس مختصر بحث کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت میں دینی و دنیاوی تعلیم کا حصول کس قدر جائز ہے؟ ہمارے دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے پر دو قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ صرف دینی تعلیم حاصل کرنے کی شریعت میں اجازت ہے اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ صرف دنیاوی تعلیم حاصل کر کے کامیاب ہوا جاسکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دینی و دنیاوی علوم حاصل کر کے انسان زیادہ ترقی کرسکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق قرآن پاک بھی کرتا ہے، قرآن پاک میں ہے **واعدوا لهم ما استطعتم من قوة** (۵) ترجمہ: تیاری کرو! جتنی بھی کی جاسکتی ہے قوت حاصل کرنے کے لیے۔''

یہاں قوت کے حصول سے مراد جدید ترین ٹیکنالوجی کا حصول ہے اس میں ہمیں اپنے دور کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنا پڑے گی۔ یہ تو ہمارے لیے اللہ نے قرآن مجید میں فرض کر دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی علوم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اور وہ لوگ جو یہ کہتے اور سمجھتے ہیں کہ صرف دینی کتب کی تیاری سے کام بن جائے گا، وہ بھی غلط ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دنیوی علوم سے کام بن جائے گا وہ بھی غلطی پر ہیں۔ دونوں کے حسین امتزاج ہی سے کام چلے گا۔ ان کو باہم یک جان کرنے سے کام بنے گا۔ اس کے بغیر تیاری ممکن نہیں لیکن سائنسی علوم کے حصول سے قبل اچھا مسلمان اور اچھا انسان بننا ضروری ہے۔ اس لیے ایسی طرزِ تعلیم کی ضرورت ہے جس میں دینی، روحانی اور دنیوی علوم خوبصورت توازن کے ساتھ یک جان ہو چکے ہوں۔ اس کے بغیر اس آیت پر عمل ممکن نہیں۔

محمد سالم قدوائی صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''دینی نصاب میں دنیوی علوم شامل ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، طب، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، اقتصادیات وغیرہ سے ہمارے دینی مدارس بے تعلق ہو چکے ہیں اور ان کے فارغ التحصیل طلبہ دنیوی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس بنا پر یہ ادارے اچھے طالبعلم کی توجہ کا مرکز بھی نہیں بنتے۔ جس کی وجہ سے ان کا تعلیمی اور تدریسی معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ پھر سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ایسا نظامِ تعلیم جس میں موجودہ علوم کے مادیات کی گنجائش نہ ہو، اپنے دامن کے تمام پرورش یافتگان کو دنیوی علوم سے محرومی کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔'' (٦)

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: ''تعلیم کا صرف ایک ایسا نظام ہونا چاہیے جس میں دینی اور دنیاوی تعلیم یکساں اہمیت کے ساتھ درس میں شامل ہو۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر شخص خواہ اس نے علمِ دین میں تخصیص حاصل کیا ہے یا علوم دنیا کے کسی شعبہ میں دینی علم سے رابطہ رکھتا ہوگا۔ اس طرح پورے تعلیمی نظام اور پورے معاشرے میں دین کی بالادستی قائم ہوجائے گی، سارے عالم میں دین کی فضا چھا جائے گی۔'' (۷)

اس بحث کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ کس قسم کا نظام تعلیم پاکستان کی مثالی

ضرورت کے مطابق ہوگا؟

لفظ تعلیم کے معنی و مفہوم

لفظ ''تعلیم'' عربی کے سہ حرفی لفظ ع۔ل۔م سے ماخوذ ہے جس کے معنی جاننا، یقین کرنا، سمجھنا، واقفیت حاصل کرنا ہیں۔ بالفاظ دیگر تعلیم کا لفظی مفہوم کسی کو دینا یا بہم پہنچانا ہے مگر تعلیم محض علم پہچاننے کا نام بھی نہیں اس میں، اخلاقی اور معاشرتی لین دین کی تربیت ہوتی ہے۔ لفظ تعلیم کو انگریزی میں ایجوکیشن (Education) کہتے ہیں یہ لفظ (Ede) سے بنا ہے جس کے معنیٰ نکالنا ہیں۔ ایک خیال کے مطابق یہ لفظ لاطینی زبان کے دو لفظ (E) یعنی نکالنا اور (Ducere) یعنی مدد کرنا سے ماخوذ ہے جس کے معنی باہر نکالنے میں مدد دینا ہے۔

نبی کریمؐ کی تعلیم کا آغاز بھی **اقرأ باسم ربک الذی خلقo خلق الانسان من علقo اقرأ وربک الاکرمo الذی علم بالقلمo** (۸) ترجمہ: پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔

آپؐ کی آمد ہی سے علم سیکھنے اور سکھانے پر زور دیا گیا۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے ہمیشہ علم اور طالبانِ علم کی عظمت کو مختلف طرح ان کے ذہن نشین کیا۔ چنانچہ فرمایا کہ: ''صاحبِ علم کو عبادت گزار پر اتنی فضیلت حاصل ہے جتنی مجھ کو تم میں سے کسی معمولی فرد پر حاصل ہے۔'' (۹) طلبِ علم کی فضیلت کے بارے میں فرمایا کہ ''طالبان علم کے لیے فرشتے اپنے بال و پر فرش پر بچھاتے ہیں۔'' (۱۰) علم کو مہد سے لحد تک جاری رکھنے کی تلقین فرمائی۔ (۱۱) اور فرمایا کہ طلبِ علم ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔ (۱۲) علم سیکھنے سکھانے پر جس قدر زور آپؐ نے دیا شاید ہی کسی نبی نے دیا ہو۔ اس کا علم اس بات سے ہوتا ہے کہ بدر میں گرفتار کیے جانے والے بعض کفار قیدیوں کی رہائی کے لیے آپؐ نے ۱۰، ۱۰ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے والے کو ان کا فدیہ قرار دیا۔

بعض صحابہ کو آپؐ نے عبرانی زبان سیکھنے پر مامور کیا، اور نماز کی امامت میں قراءِ قرآن مجید کو سب سے زیادہ اولیت دی۔ آپ کے دور میں تعلیم کا اتنا چرچا ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں صرف دمشق کی مسجد کے اندر بیک وقت ۱۴، ۱۴ سو طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ حیرت انگیز کامیابی صرف تیس سال کی مختصر مدت میں عمل میں آئے اور دنیا نے آپؐ کی تعلیم و تربیت کا سو فیصد نتیجہ دیکھا۔ تاریخ انسانیت کے کسی معلم کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی بہرحال آنحضرتؐ کے انداز تعلیم و تربیت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں، لیکن میں یہاں کچھ خصوصیا کا ذکر کروں گا کہ جس پر عمل کر کے ہم پاکستان کے لیے مثالی نظامِ تعلیم کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ اس راستے سے ہٹ کر ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے

اور اس سے بڑھ کر طرزِ تعلیم کا نمونہ ہمیں کہیں نہیں مل سکتا۔

نظامِ تعلیم کی درستگی کے لیے استاد اور شاگرد کی تربیت کی اشد ضرورت ہے اس کے بغیر نظامِ تعلیم درست نہیں ہوسکتا۔ نظامِ تعلیم کے اصول ہمارے بہت سے علماء کرام نے اپنے اپنے مضامین بڑی محنت سے حضور انورؐ کے طریقۂ تعلیم سے اخذ کیے ہیں اور یہ اصول ایک دوسرے سے تقریباً ملتے جلتے ہیں۔ عاجز بھی اپنے ان بزرگوں کے اصولِ نظامِ تعلیم کی روشنی میں لکھنے کی کوشش کرے گا۔

مولانا وصی مظہر ندوی صاحب نے اپنی کتاب 'تعلیم و تربیت کے اصول' میں کچھ اصول سیرت النبیؐ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) متعلم کی توجہ کو مرکوز کرنا: یہ تعلیم میں کامیابی کے لیے پہلی شرط ہے کہ استاد شاگردوں کی توجہ کو مرکوز کرنے میں کامیابی حاصل کرے تاکہ وہ استاد کی بات دلچسپی کے ساتھ سنیں اور اس طرح ان کے ذہن و دماغ میں مطلوب تعلیم کا نقش ثبت ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے نبی کریمؐ متعلمین سے سوال معلوم کر کے ان کو جواب معلوم کرنے کی طرف متوجہ کرتے۔ ''رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابۂ کرام ؓ کو ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کی تعلیم دینے کی خاطر سوال کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟ کون سا مہینہ ہے؟ اور کون سا دن ہے؟ صحابۂ کرام ؓ کہتے ہیں کہ ہم نے خیال کیا کہ شاید رسول اللہؐ شہر، مہینہ اور دن کے نام تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی مبارک زبان سے مکہ شریف، ذی الحجہ اور یوم النحر کا نام لیا اور فرمایا کہ جس طرح تمہارا یہ شہر، تمہارا یہ مہینہ اور تمہارا یہ دن حرمت و عظمت والے ہیں، اسی طرح تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں بھی حرمت اور عظمت رکھتی ہیں۔'' (۱۳) سوال کے اسلوب کو اور زیادہ مؤثر بنانے کے لیے بعض دفعہ آپ کوئی ایسا سوال کرتے جس کا جواب ہر شخص دے سکتا لیکن آپ اس معروف جواب کے بجائے سوال کا جواب دیتے ہوئے کسی ایسی حقیقت کی تعلیم دیا کرتے تھے مثلاً ''ایک بار آپؐ نے دریافت کیا **اتدرون المفلس**؟ کیا تم کو معلوم ہے مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا، یارسول اللہؐ ہم اُسے مفلس کہتے ہیں جو درہم اور دینار سے تہی دست ہو۔ آپؐ نے فرمایا میری امت کا مفلس انسان وہ ہے جس نے دنیا میں نیکیاں تو بہت کی ہوں لیکن لوگوں کے حقوق بھی بہت مارے ہوں تو قیامت کے دن اس کی ساری نیکیاں اس سے لے کر ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن کے حقوق اس نے تلف کیے تھے اور اگر اس طرح بھی حساب برابر نہ ہوا تو ان لوگوں کے گناہ ان سے لے کر اس شخص پر ڈال دیئے جائیں گے۔'' (۱۴) تعلیم کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے بھی آنحضرتؐ اصل مقصود کے اظہار سے قبل کوئی نہایت چونکا دینے والی بات فرماتے تاکہ سامعین پوری طرح متوجہ ہوجائیں۔ مثلاً ایک بار'' آپؐ نے فرمایا اس شخص کے لیے تباہی ہو، اس شخص کے لیے تباہی ہو، اس شخص کے لیے تباہی ہو۔ اصحاب نے دریافت کیا کہ وہ کون بدبخت ہے جس کے بارے میں حضور اکرمؐ یہ ارشاد فرما رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا! بوڑھ ماں باپ کی

خدمت نہ کرنے والے کے لیے۔''

(۲) **عملی مظاہرہ:** کسی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے استاد کو متعلمین کے سامنے عملی مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے چنانچہ حضور انورؐ نے بھی اپنی تعلیم کا بیشتر حصہ عملی مظاہرہ کے ذریعے عام فرمایا: مثلاً ''ایک شخص نے حضور اکرمؐ سے نماز کے اوقات دریافت کیے آپؐ نے اس کو اپنے پاس دو دن تک روک لیا پہلے دن آپؐ نے پانچوں نمازیں نہایت اوّل وقت میں ادا کیں اور دوسرے دن ساری نمازیں آخری وقت میں ادا کیں۔ اور پھر سائل سے کہا کہ نماز کا وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان ہے۔'' اسی طرح آپؐ نماز کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح نماز پڑھو۔'' اسی طرح حج کے بارے میں فرمایا: ''**خذوا عنا مناسککم**۔(۱۵) حج کے مناسک تم مجھ سے عملاً حاصل کرو۔'' بعض اوقات کسی علمی نکتے کو سمجھانے کے لیے اس کو مخصوص شکل میں پیش کرنا پڑتا ہے چنانچہ ایک بار قرآن کی اس آیت کی تفسیر فرما رہے تھے۔ **وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبیل فتفرق بکم عن سبیلہ** O (۱۶) اے بندو! یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اس راستہ کی پیروی کرو۔ دوسری راہوں پر نہ چلو ورنہ وہ راہیں تم کو میری راہِ راست سے دور کر دیں گی۔ پھر آپ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے ساتھ بہت سی لکیریں ٹیڑھی ترچھی بنا کر بتایا کہ منزل تک پہنچانے والی یہ سیدھی لکیر ہے۔

(۳) **تکرار و اعادہ:** حضور انورؐ ہر بات کا اعادہ فرماتے تا کہ سننے والے اچھی طرح سمجھ کر یاد رکھ سکیں۔ چنانچہ ایک بار حضور انورؐ شرک اور جھوٹی گواہی کی برائی کو ذہن نشین کرانے کے لیے اس جملے کا بار بار دیر تک اعادہ کرتے رہے ''بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور جھوٹی گواہی دینا ہے۔'' ہمارے معلمین کو اس طرف توجہ دینے کی شدید ضرورت ہے تا کہ ہمارے متعلمین کو استاد کی بات کو دوبارہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ بعض شاگرد استاد سے پوچھتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ استاد کا رعب اتنا ہوتا ہے کہ شاگرد کچھ پوچھ نہیں سکتا اگر پوچھ لے تو اسے ڈانٹتے ہیں کہ لیکچر کے وقت سو رہے تھے۔ اگر حضور اکرمؐ کے اس فرمان عمل کریں کہ ہر بات دو یا تین بار دہرا دیں تو متعلم کو پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

(۴) **تشبیہات کا استعمال:** معلم کو کوئی بات متنظم کے ذہن میں بٹھانے کے لیے مثالوں کا استعمال کرنا چاہئے کہ جس کی وجہ سے متعلم کو وہ بات زندگی بھر یاد رہ سکے مثلاً ''آپؐ نے ایک بار دریافت کیا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے دریا رواں ہو اور وہ اس میں پانچ مرتبہ دن میں غسل کرتا ہو تو کیا اس کے جسم پر پھر کچھ میل کچیل باقی رہے گا؟ صحابہؓ نے جواب دیا نہیں یارسول اللہؐ۔ آپؐ نے فرمایا پانچ وقت کی نمازوں کی یہی مثال ہے۔ ان نمازوں سے اللہ تعالیٰ اسی طرح گناہوں کو مٹاتا رہتا ہے۔'' ایک اور مرتبہ دنیا کہ حقیقت ذہن نشین کراتے ہوئے فرمایا کہ ''آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسی

ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈبوئے تو سمندر میں سے جتنا پانی اس کی انگلی میں لگے گا آخرت کے مقابلے میں دنیا کی بھی وہی نسبت ہے۔''

(۵) سائل کے سوال کو توجہ سے سننا: کسی شخص کو اپنی بات سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھا جائے اس غرض سے معلم کو شاگرد کا سوال توجہ سے سننا چاہئے تا کہ ایک طرف سائل کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ اس کی بات مکمل توجہ سے سنی گئی ہے۔ دوسری طرف جواب دینے والا اصل ذہنی الجھن کو سمجھ کر شافی جواب دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ کے متعلق صحابہؓ کا بیان ہے کہ آپ کسی کی بات نہ کاٹتے تھے جب کہنے والا اپنی بات پورے اطمینان سے کہہ لیتا تو آپ اس کا جواب دیتے تھے۔

(۶) سوال و جواب کا ذریعہ تعلیم: یہ طریقۂ تعلیم زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے اور اس طریقے سے طالبعلم زیادہ بہتر طریقے سے مسائل کو سمجھ لیتا ہے۔ اس طریقِ تعلیم کی متعدد مثالیں حضور اکرمؐ کے مدرسہ علمی میں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک بار یا ایک سے زیادہ مرتبہ حضرت جبریلؑ انسانی شکل میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے حضور اکرمؐ سے کئی سوالات کیے تا کہ صحابہ کرامؓ ان سوالوں کے صحیح جوابات سے واقف ہو جائیں۔

(۷) قول و عمل کی یکسانی: آنحضرتؐ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی وعدہ خلافی نہیں کی جو کہا اس پر عمل کر کے دکھایا مثلاً رات کو نفلی قیام کی وجہ سے پیروں میں ورم ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپؐ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کی اگلی پچھلی تمام کوتاہیاں معاف کر دی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا! **افلا اکون عبداً شکوراً** (۱۷) کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

(۸) نفسیات کا لحاظ: یہ بھی ایک ضروری امر ہے جس کی طرف استاد کو خاص خیال رکھنا چاہیے۔ آنحضورؐ اس کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔

(۹) طویل خطبوں سے اجتناب: موجودہ دور میں اس چیز کا خاص کیال رکھنا چاہئے کہ وعظ و نصیحت اور خطبوں کو طویل نہ کریں س سے لوگ اکتا جاتے ہیں اور پھر کسی ایسی جگہ نہیں جاتے جہاں ایسی حرکت ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ بھی طویل خطبوں سے اجتناب کرتے اور دوسروں سے بھی لمبی لمبی یا بے موقع نصیحتیں کرنے سے منع کرتے تھے۔

(۱۰) عزت نفس کا خیال: ہمارے معلمین اس بات کا بالکل خیال نہیں کرتے اور اپنے شاگردوں کو اتنی بری طرح بے عزت کرتے ہیں کہ اس سے طالبعلم میں ضد اور اپنی غلطی پر اصرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپؐ کسی کو تنبیہہ کرنا چاہتے تو اکیلے میں یا مجمع میں عام طور سے فرما دیتے جس سے کسی کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ مثلاً ما

بال اقوام یفعلون کذا بعض لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ فلاں کام کرتے ہیں۔ (۱۸) اگر کسی شخص کی برائی کا ذکر نام لے کر کرنا چاہتے تو اس شخص کی بہت خوبیاں بیان کرتے مثلاً ایک بار آپ نے ایک شخص کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا! ''**انعم الرجل خریم الاسدی**'' خریم اسدی بہت اچھا انسان ہے کاش اس میں فلاں کمزوریاں نہ ہوتیں۔''

(۱۱) اصلاح میں صبر و تحمل: یہ امر بھی استاد کے لیے ضروری ہے ورنہ غصّہ میں آ کر بچوں پر زیادتی کرے گا۔ حضور اکرمؐ کا یہی طریقہ تھا مثلاً ''ایک بدوی مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرامؓ نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو روک دیا۔ جب اعرابی پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرتؐ نے نہایت شفقت سے اسے فرمایا کہ یہ مساجد اس قسم کے معاملہ کے لائق نہیں ہیں۔ آنحضرتؐ نے بڑی حکمت کے ساتھ معاملہ کو سلجھایا کہ اعرابی کو ناگوار بھی نہیں گزرا اور اس کی سمجھ میں بھی آ گیا۔'' (۱۹) اسی طرح آنحضرتؐ کسی ذاتی تکلیف کی وجہ سے کسی پر غصّہ نہ فرماتے۔ ''حضرت انسؓ ذکر کرتے ہیں کہ میں سرکار کی خدمت میں دس سال رہا اس عرصہ میں آنحضرتؐ نے مجھے کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں فرمائی اور جو کام میں نے کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور جو کام میں نے نہیں کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔'' (۲۰)

(۱۲) اخلاص، خیر خواہی اور ہمدردی: معلم کو اپنے اندر اخلاص کی کیفیت بھی پیدا کرنی چاہیے جس سے متعلم کے قول و عمل میں اخلاص کا رنگ، خیر خواہی کی مٹھاس اور ہمدردی کی لذت محسوس ہو۔ خیر خواہی اور ہمدردی کا مطلب یہ نہیں کہ رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں کی حمایت کر کے انہیں فائدہ پہنچایا جائے اور بے گناہ شخص کو قانون کے حوالے کر دیا جائے۔ ''ایک بار فاطمہ نامی ایک بااثر قریشی عورت نے چوری کی۔ نبی کریمؐ کے سب سے پیارے صحابی اسامہ بن زاہدؓ جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے، حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ اُن کی سفارش سُن کر بے حد ناراض ہوئے اور فرمایا کہ پہلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ بے حیثیت مجرموں کو سزا دی جاتی تھی اور بااثر لوگ سزا سے بچ جاتے تھے۔ پھر آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' اخلاص سے متعلق حضرت امام ابو یوسف کا قول ہے کہ ''اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہے۔''

(۱۳) اجتماعی ماحول کے ذریعہ اصلاح: معلم کو درسگاہ کا ماحول اور معاشرہ کا ماحول اس طریقہ سے درست کرنا چاہیے کہ جس سے ماحول میں برائی ہو ہی نہ سکے۔ اس مقصد کے لیے نبی کریمؐ نے مسلم معاشرے کے ہر فرد میں **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** کی روح پھونک دی اور ہر شخص کو اپنے اپنے دائرہ میں ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔**'' (۲۱) ترجمہ: تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کے حلقۂ ذکر

کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔'' اس حدیث کی روشنی میں معلمین کو چاہیے کہ **امر بالمعروف و نھی عن المنکر** کی طرف خاص توجہ مبذول کرائیں تا کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رسوا ہونے سے بچ جائیں۔

مولانا وصی مظہر ندوی صاحب کے اصول نظام تعلیم جو کہ معلمین سے متعلق تھے، ان کا خلاصہ پیش کیا گیا۔اس کے علاوہ اور بہت سے اصول ہیں، جن کی تفصیل ذکر کرنا بہرحال مشکل ہے مگر مختصراً کچھ اور اصول بھی نظر آتے ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

زہد وقناعت: معلمین کو اس طرف بھی خصوصاً توجہ دینی چاہیے کیونکہ معلمین جب تک خود زہد وقناعت اور خودداری پر عمل نہیں کریں گے تو ضرور اس کا ردّ عمل بچوں کے لیے مضر ہوگا۔ معلم کبھی اپنے شاگرد کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اس اسے اس کی حیثیت میں فرق آتا ہے جو کہ نظام کو خراب کرتا ہے۔ حضور انورؐ غزوۂ احزاب میں صحابہ کرام ؓ کے ساتھ موجود تھے۔ صحابہ کرام ؓ نے بھوک کی شکایت کی اور پیٹ کھول کے دکھائے جہاں پتھر باندھ رکھے تھے۔ حضور اکرمؐ نے جب اپنا بطنِ مبارک کھول کر دکھایا تو اس پر دو (۲) پتھر بندھے ہوئے تھے۔

مساوات اور بھائی چارہ: معلم بچوں میں مساوات اور برابی رکھے، خصوصاً لڑائی جھگڑے کے موقع پر عدل وانصاف قائم رکھے۔ اس بات کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے **انما المؤمنون اخوۃ** (۲۲) مومن آپس میں بھائی ہیں۔ اور حضور انورؐ نے بھی اسی کی تعلیم دی اور یہ بھی فرمایا کہ قطع تعلق کرنے والے کی مغفرت نہ ہوگی۔ آپ نے جو بھی تعلیم دی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ اپنے صحابہ کے ساتھ کام میں مصروف رہتے اور ان کو اپنا بھائی سمجھتے۔ ایک موقع پر خندق کھودی جارہی تھی حضور اکرمؐ بھی ان کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے کہ کہیں صحابہ کرام ؓ کے دل میں حضور اکرمؐ کی طرف سے یہ گمان نہ ہو کہ آپ صرف حکمرانی کرتے ہیں۔

ایثار: اس کی تعلیم عموماً معلم کے الفاظ اور فلسفے سے آگے نہیں بڑھتے لیکن آپؐ نے اپنے عمل سے اس کی تعلیم دی چنانچہ حضرت فاطمہؓ جو آپؐ کی محبوب بیٹی تھیں۔ انہوں نے آکر آپؐ سے عرض کیا کہ چکی پیستے پیستے ان ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں انہیں کوئی خدمت کرنے والی دے دی جائے۔ آپؐ نے فرمایا ابھی صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا اس لیے تمہاری خواہش پر عمل ممکن نہیں۔''

آخر میں چند اور اصول ذکر کیے جاتے ہیں جن پر حکومت پاکستان اور وزارتِ تعلیم کو عمل کرنا چاہیے ورنہ نظام تعلیم جوں کا توں ہی رہے گا۔

(۱) معلمین کو تعلیم دینے سے پہلے تربیت دینی چاہیے۔
(۲) معلمین بچوں کو سخت سزائیں نہ دیں۔ اس سے اصلاح کی بجائے بچے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔
(۳) معلمین تقویٰ کا اہتمام کریں خصوصاً حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھیں۔

(۴) معلمین شاگرد کو اولاد کی طرح سمجھیں۔
(۵) معلمین بچوں پر شفیق و مہربان رہیں۔
(۶) معلمین نرمی کے ساتھ ساتھ کبھی مناسب سزا بھی دیں تو اس کی شرعاً اجازت ہے۔
(۷) معلمین غصّہ میں احتیاط سے کام لیں، زیادتی نہ کریں۔
(۸) معلمین اگر ایک وقت میں سزا دیں تو دوسرے وقت میں مناسب طریقے سے اسے راضی کریں۔
(۹) معلمین حسن تدبیر اور شاگردوں کی نفسیات کو سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کریں۔
(۱۰) معلمین اجرت کی شرط نہ لگائیں اور نہ ہی اس پر شدید تقاضا کریں۔
(۱۱) معلمین اغنیاء کے بچوں کی طرف میلان اور غرباء کے بچوں سے بے رحمی نہ کریں۔
(۱۲) معلمین کو اپنے شعبہ میں ماہر ہونا چاہیے اور ان کا تقرر بغیر کسی دباؤ کے میرٹ پر ہونا چاہیے۔
(۱۳) معلمین شاگرد کی دلجوئی کریں مثلاً کبھی کبھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیا کریں۔ اس سے اس کا دل بڑھے گا۔
(۱۴) معلمین شاگردوں کے لیے دعا کریں جیسے نبی کریمؐ نے حضرت ابن عباس ؓ کو سینے سے لگا کر فرمایا 'یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرما'۔
(۱۵) معلمین کو متعلم کی تعلیم و تربیت میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ بچوں کی کمزوریاں ان کے سامنے بیان نہ کریں اس سے سے احساس کمتری پیدا ہوتا ہے جو اس کی ذہانت کی نشونما کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس کی خوب تعریف کریں جس سے اس کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور حوصلہ بڑھے۔
(۱۶) معلمین ایک بات کے غصّہ کا اثر دوسری بات میں نہ کریں۔
(۱۷) معلمین طلبہ کی بے وقعتی نہ کریں۔
(۱۸) معلمین غصّہ کی حالت میں کوئی فیصلہ یا سزا ہرگز نہ دیں۔
(۱۹) معلمین ناحق شاگردوں کو نہ ستائیں یہ بڑا گناہ ہے۔
(۲۰) معلمین نابالغ بچوں سے خدمت نہ لیں۔
(۲۱) معلمین خلافِ شرع خدمت یا دوسروں کا کام بچوں سے نہ لیں۔
(۲۲) معلمین بے ریش بچوں کی صحبت سے پرہیز کریں۔

متعلم کے لیے اصولِ نظام تعلیم: سیرت نبویؐ کی روشنی میں معلم کے اصول، طریقۂ نظام تعلیم معلوم ہونے کے بعد متعلم کے لیے بھی کچھ اصول ہیں جن پر عمل کر کے ہمارا نظامِ تعلیم صحیح معنوں میں درست ہوسکتا ہے۔ ہمارے اساتذہ، شاگردوں اور والدین کو ان اصولوں پر مل کر عمل کرنے کی ضرورت

ہے کیونکہ دونوں کے تعاون کے بغیر اس نظامِ تعلیم کو لاگو کرنا ناممکن ہوگا۔

متعلم کے اصول:

(۱) متعلم کے لیے لازم ہے کہ وہ استاد کو باپ کی جگہ تصور کریں۔

(۲) استادوں کی عزت کریں جیسا کہ حدیث میں ہے ''**تواضعوا لمن تتعلمون منه** (۲۳) جس استاد سے تم علم حاصل کرو اس کا ادب واحترام کرو۔'' اس سلسلے میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں: **من علمی حرفا فقد صیرنی عبداً** جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا اس نے گویا مجھے اپنا غلام بنایا۔ اب چاہے مجھے رکھ لے چاہے فروخت کردے۔

(۳) استاد کی سختی برداشت کریں تب ہی کامیابی ہوگی۔

(۴) اساتذہ کے لیے دعا گو رہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت حمادؒ کے لیے ہر نماز کے بعد اپنے والدین سے بھی پہلے دعا اور استغفار کرتا ہوں۔

(۵) اساتذہ کے ساتھ آواز بلند کر کے باتیں نہ کریں۔ یہ ناشائستگی ہے۔

(۶) حضرت علیؓ نے طالبعلم کو چند نصائح فرمائی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: عالم (استاد) کا یہ حق ہے کہ اس سے کثرت سے سوالات نہ کیے جائیں، نہ اس سے بحث کی جائے، نہ اس کی طرف سے اشارہ کرے، نہ اسے کنکھیوں سے دیکھے، نہ اس کے پوشیدہ بھیدوں کی کھوج میں لگے، نہ اس کے سامنے کسی کی غیبت کرے اور وہ خواہ موجود ہو یا غائب ہر حال میں اس کے مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرے، مجلس میں اس کے سامنے بیٹھے، اگر استاد کو کوئی ضرورت پیش آئے تو اس کی خدمت میں سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ (۲۴)

(۷) آپؐ نے طالبعلم کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ علم صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے حاصل کیا جائے۔

(۸) متعلم دنیاوی اغراض کے لیے علوم دین حاصل نہ کرے اس پر ایک حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: جس شخص نے وہ علوم جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں، دنیاوی اغراض حاصل کرنے کے لیے سیکھے تو وہ روزِ قیامت جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا۔'' (۲۵)

(۹) متعلم علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کرے۔ اسی بناء پر آپؐ نے حصولِ علم کے ساتھ ساتھ عمل کی بھی تاکید فرمائی ہے اور عمل نہ کرنے پر سخت وعید بیان کی ہے۔ ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ روزِ قیامت اللہ کے نزدیک سب سے برا شخص وہ عالم ہوگا جس نے اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا۔

(۲۶)　اور زیاد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے کسی چیز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ علم کے جاتے رہنے کے وقت ہوگا۔ یہاں تک کہ کچھ علم نہ بچے گا، زیادؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ علم ہم سے کیسے جاتا رہے گا جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور ہم یہ اپنی عورتوں اور بچوں کو پڑھاتے رہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا افسوس میں تو تمہیں مدینہ کا سمجھدار آدمی سمجھتا تھا، یہ یہودی اور عیسائی بھی تو توریت اور انجیل پڑھتے ہیں پس انہیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ (۲۷)

خلاصۂ کلام:

آپؐ نے تعلیم و تربیت پر جو زور دیا ہے اور معلم و متعلم کو سیکھنے سکھانے کے جو اصول وطریقے بتائے ہیں ہمیں ان ہی اصول وطریقوں پر رہ کر اپنے معلمین و متعلمین کی تربیت کرنی چاہیے کیونکہ آپؐ کی ذاتِ گرامی سے بڑھ کر اور آپؐ کی تعلیمات سے بڑھ کر کسی اور کی تعلیمات نہیں ہوسکتیں۔ اس مضمون میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اصولِ نظامِ تعلیم ذکر کیے جائیں جو آپؐ نے ہمیں بتائے اور سکھائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان اصولوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حوالہ جات

(۱)　سورۃ المجادلۃ　آیت ۱۱۔

(۲)　سورۃ البقرۃ　آیت ۱۲۹۔

(۳)　تعلیم وتہذیب۔ پروفیسر حمید احمد خان۔ص ۷۶۔ مجلس ترقی ادب　لاہور　۱۹۷۵ء۔

(۴)　تعلیم وتہذیب۔ پروفیسر حمید احمد خان۔ص ۷۸۔ مجلس ترقی ادب　لاہور　۱۹۷۵ء۔

(۵)　سورۃ الانفال　آیت ۶۰۔

(۶)　افکار واحوال۔ محمد سالم قدوائی۔ ص ۴۳۔ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بھارت۔

(۷)　افکار واحوال۔ محمد سالم قدوائی۔ ص ۷۷۔ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بھارت۔

(۸)　سورۃ العلق　آیت ۱ تا ۵۔

(۹)　ہادیٔ اعظم۔ سید فضل الرحمن۔ ص ۵۳۴۔ زوار اکیڈمی کراچی ۲۰۰۰ء۔

(۱۰)　ترمذی۔ ۳۱۲/۴۔ حدیث ۲۶۹۱۔

(۱۱)　احیاء العلوم۔

(۱۲)　المعجم الکبیر۔ ۲۴۰/۱۰۔ طبعۃ العراق۔

(۱۳)　مشکوٰۃ شریف۔ ص ۲۳۳ بحوالہ بخاری ومسلم۔

(۱۴)　تفسیر بغوی۔ ۷۵/۶

(۱۵) فتح الباری۔ ۱/۲۱۷، ۴۹۹۔ دارالفکر۔

(۱۶) سورۃ الانعام آیت ۵۳۔

(۱۷) بخاری۔ ۲/۶۳ دارالفکر۔

(۱۸) اتحاف السادۃ المتقین ۔ ۷/۵۴۲۔ تصویر بیروت۔

(۱۹) مشکوٰۃ شریف۔ ص ۵۲۔ بحوالہ بخاری ومسلم۔

(۲۰) مشکوٰۃ شریف۔ ص ۵۱۸۔ بحوالہ بخاری ومسلم۔

(۲۱) بخاری۔ ۲/۶، ۳/۱۹۶۔ دارالفکر۔

(۲۲) سورۃ الحجرات آیت ۱۰۔

(۲۳) حیاۃ الصحابہ۔ ۳/۴۴۸۔

(۲۴) مستدرک۔ ۱/۱۶۰۔

(۲۵) ترمذی۔ ۴/۲۹۸۔ حدیث ۲۶۶۴۔

(۲۶) مشکوٰۃ۔ کتاب العلم الفصل الثالث۔

(۲۷) ترمذی۔ ۴/۲۹۷۔ حدیث ۲۶۶۲۔

======================

تعلیم و تربیت خالد محمود

اسلامیات کے نصاب سے قرآنی سورتوں کا اخراج

وفاقی وزارت تعلیم کے شعبہ نصاب نے جماعت نہم کی اسلامیات میں سے تینوں سورتیں انفال، احزاب اور الممتحنہ نکال دی ہیں اور ان کی جگہ چند آیات ڈال دی ہیں۔ کتاب کا حجم بھی کم کر دیا ہے اور مختصر سی کتاب کو نویں اور دسویں میں تقسیم کر کے غیر مؤثر کر دیا ہے۔ اس طرح وزارت ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو قرآن سے دُور کرنے کی عالمی سازش میں ملوث ہوگئی ہے۔ پہلا نصاب اتنا کمزور نہیں تھا لیکن اگر حکومت اسے بہتر بنانا چاہتی تھی تو یہ ہوسکتا تھا لیکن موجودہ حکومت کا رویہ شروع دن ہی اسلامیات و قرآن کے ساتھ معاندانہ رہا ہے۔ یہ محض بعض سیکولر دانشوروں یا بیرونی فنڈز سے چلنے والی بعض این جی اوز کا پروپیگنڈا تھا کہ یہ نصاب بہت مشکل ہے ورنہ طلبہ کی اکثریت برسوں سے اس نصاب میں آسانی سے پاس ہو رہی تھی۔ اس حکومت نے ایک پلاننگ کے تحت پہلے حصہ مڈل سے عربی لازمی ختم کر کے اس کی جگہ کمپیوٹر لگا کر ہمارا امتحان لیا۔ جب عوام اور دینی قوتوں کی بے حسی اور عدم دلچسپی دیکھی تو اگلے مرحلہ میں اسلامیات لازمی سے قرآن مجید کی سورتیں نکال کر اپنے خبث باطن کا ثبوت دیا۔

وفاقی حکومت کے وزراء کا تو یہ حال ہے کہ ان میں سے ایک نے قرآن کے چالیس پارے بنا دیے جب کہ دوسرے کو سورہ اخلاص پڑھنی نہ آئی جو کہ ہمارے عام گھروں میں پرائمری پاس بچہ بھی سنا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے اسلامیات کا نصاب بہتر بنانے کی بجائے اس میں سے قرآن مجید ہی کو نکال باہر کیا۔

سرحد حکومت کا اعلان خوش آئندہ ہے کہ وہ اسلامیات کا نیا نصاب اپنانے کی بجائے پرانے نصاب ہی کو ترجیح دے گی۔ حکومت پنجاب کو بھی دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دینا چاہیے اور اسلامیات کی پرانی کتاب ہی پنجاب میں پڑھانی چاہیے اور نئی کتاب کو ردّ کر دینا چاہیے۔ عوام اور دینی قوتوں کا فرض ہے کہ وہ اسلامیات کے نصاب میں سے قرآنی سورتوں کے اخراج کی بھرپور مذمت کریں کہ قرآن کی تعلیم ہی ہماری دنیا وآخرت سنوار سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو دان طبقے کے لیے قرآن سیکھنا بہت آسان ہے کہ عربی کے اکثر الفاظ تو پہلے ہی اردو میں مستعمل ہیں اور قرآن سکھانے کے بہت سے جدید طریقے بھی وجود میں آ گئے ہیں لیکن جب نیت ہی نہ ہو تو ان سے فائدہ کون اٹھائے؟

تعلیم و تربیت

دینی مدارس کے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت

مولانا محمد خاں شیرانی

تیسری صدی کی ابتدا میں ہند، ایران اور یونان کے فلسفے کا ترجمہ ہوا۔ اس سے علم کو ترقی حاصل ہوئی۔ اسلامی حکومت کے زوال کی وجہ سے ہمارے ہاں سرکاری زبان تبدیل ہوگئی اور ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل ماہرین کی کھپت نہ رہی۔ رفتہ رفتہ ہمارے نظام تعلیم سے تجربے کا عنصر نکل گیا اور ہمارے ادارے دینی تعلیم تک محدود ہو کر رہ گئے۔ حکومتوں کے زیر اثر فنی ادارے تشکیل پائے۔ یہ ایک انتہا پر جاتے رہے اور وہ دوسری انتہا پر۔ بعدازاں وہ اس لیے کامیاب ہو گئے کہ انہوں نے فلسفے کو مذہب کے مقابل لا کھڑا کیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مذہب خالق کا فرمان ہے تو کائنات اسی خالق کا عمل ہے۔ جب فرمان اور عمل ایک کا ہو تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ تضاد بظاہر نظر بھی آئے تو وہ دراصل ہوتا نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم صحیح معنی سمجھ ہی نہ سکیں۔ لہٰذا تضاد نہیں تھا، انہوں نے پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ فلسفے کا علم بھی ہمارے نظامِ تعلیم سے نکل گیا اور صرف مذہبی تعلیم باقی رہ گئی۔ جب دنیا دلیل و عقل کی بات کرے اور ہم فتوے کی بات کریں تو یہ عجیب بات ہے۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ مدارس کے اتحاد کے ساتھ ساتھ ان کے نصاب کو بھی عصری تقاضوں کے مطابق جامع تر بنانے کی ضرورت ہے۔

علامہ مفتی غلام مصطفی رضوی

ویسے تو ہمارا درس نظامی انتہائی جامع اور انتہائی مکمل ہے لیکن اس میں کچھ ایسی کتابیں ہیں جن کے بارے میں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ دور جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں جیسے پرانے دور کی فلسفے اور ہیئت کی کتابیں ہیں، ایک تو بہت مشکل ہیں طلبہ سمجھ بھی نہیں پاتے۔ ان کے بجائے ہمیں دوسری کتب شامل

کرنی چاہئیں مثلاً قرآن پاک، حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، یعنی ایسی کتابیں جن سے ہمارے معاش اور معاشرت کا بہتر تعلق ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کے تقاضے ہیں مثلاً انگریزی جو ایک بین الاقوامی زبان ہے، وہ ضرور نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔ اسی طرح ریاضی اور کمپیوٹر کا علم، نیز دور جدید کی اہم ضروریات کے مطابق جو علوم اس دور میں رائج ہیں، ان کا کافی حصہ ہمارے نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔

ہمارا دینی تناظر

مولانا سلیم اللہ خاں صاحب☆ کا مکتوب گرامی

ملی مجلس شرعی کے سینئر نائب صدر مولانا زاہد الراشدی کے نام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

حضرت والا! آپ نے ملی یکجہتی کانفرنس (ملی مجلس شرعی کی اتحاد امت کانفرنس) کے متعلق فقیر کی رائے اور تعاون کے متعلق معلوم کرنے کے لیے والا نامہ اور کانفرنس سے متعلق مطبوعہ مواد ارسال فرمایا ہے۔

اس مکتوب گرامی کے مطالعے پر پہلا تاثر تو یہ تھا، کہاں یہ ذرہ نوازی اور کرم فرمائی اور کہاں یہ عاجز وخاکسار، دونوں میں کوئی ربط سمجھ میں نہ آیا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا لکھوں؟ اللہ بزرگ و برتر کی رحمت سے مایوسی کفر ہے، ادھر حالات حوصلہ شکن ہیں۔ صلاح وفلاح کے راستے نہ صرف مسدود ہیں بلکہ ان پر جبر ومکر کا پہرہ ہے۔ وارثان نبی علیہ الصلاۃ والسلام جو اس مشکل کو حل کرنے کے ذمہ دار تھے، وہ نہ صرف اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر پا رہے بلکہ وہ طاغوت کے ہم نوا نظر آ رہے ہیں۔ کوئی جدیدیت کی رو میں بہ کر جدت پسند نما ہوا ہے اور حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھا ہے۔ کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ زنادقہ کی معاونت اور پشت پناہی کر رہا ہے، کسی نے مال بٹورنے کے لیے نئے نئے جال بُن رکھے ہیں اور دلکش حجابات کے ذریعہ قوم کو گمراہ کر رہا ہے۔ موجودہ کسی بھی اصلاحی کوشش میں معروف احکام شریعت کی پاس داری نظر نہیں آتی۔ جتنے سلسلے آج اسلامی نظام کے احیاء کے لیے موجود ہیں، مجھے ان کے ذریعے کامیابی کی امید نہیں، **لا فعل اللہ ذلک**۔

عیار، مکار دشمن نے اور نفسانیت وشیطنت کے نتیجے میں اپنے ہی مسلک کے دعوے دار ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے ہیں اور اتحاد قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس المناک صورت حال سے احقر سخت پریشان ہے اور بظاہر کوئی علاج نظر نہیں آ رہا۔ کئی مرتبہ

درخواست کر چکا ہوں لیکن نتیجہ صفر رہا ہے۔ دوسری خرابیوں کا بھی یہی حال ہے، غلط روش چھوڑنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔

معروف تبلیغی طریق کار اور موجودہ مدارس کے نظام کے علاوہ ہر جگہ ابتری ہے۔ تبلیغ اور مدارس کے نظام میں بھی کئی پہلو قابل اصلاح ہیں لیکن دوسروں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ اگر خانقاہی نظام

☆ صدر وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

کو دیکھیں تو تھانہ بھون کی خانقاہ، رائے پور کی خانقاہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کی خانقاہ کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ خواجۂ خواجگان مولانا خان محمد کندیاں صاحب کی خانقاہ تھی جو مرکز اہل معرفت کا درجہ رکھتی تھی مگر ان کی رحلت کے بعد اس کی مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔

تحفظ ناموس رسالت کے لیے بڑے پیمانے پر پاکستان اور بیرون پاکستان کام ہوا ہے اور اس کے نتائج بھی اچھے حوصلہ افزا سامنے آئے ہیں لیکن اس میں بھی اختلاف و انتشار پیدا کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔

دین اسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا پسندیدہ واحد دین ہے اور تا قیامت اس کو باقی رہنا ہے، اس نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، وہی ہمیشہ ہوش ربا، مہلک اور تباہ و برباد کرنے والے حالات میں اس کی حفاظت کرتا رہا ہے، ان شاءاللہ اب بھی اللہ بزرگ و برتر اس کی حفاظت فرمائیں گے۔

فقیر کی یہ تحریر جناب والا کے لیے ملالِ خاطر کا سبب ہوگی۔ یہ سمجھ کر کہ کاتب تحریر ناہنجار، کمینہ اور رذیل ہے، اس کے سوا اس کو کچھ سوجھتا ہی نہیں **'واذا مروا باللغو امروا کراما'** کے مطابق درگزر فرما دیں۔ **جزاکم اللہ خیرا کثیرا، آمین۔**

ملی یکجہتی کانفرنس کے اجلاس میں جو فیصلے کیے گئے ہیں، وہ اچھے فیصلے ہیں، اگر ان کو روبعمل لایا جا سکے، تو مفید ہوگا، مگر محترم! اس سے پہلے بھی ہم سب کے بزرگوں کی کوشش سے عمدہ، اچھے اور مفید فیصلے ہوئے ہیں لیکن کیا نتیجہ نکلا؟ جو اب نکلے گا، ہاں نیت اچھی ہو، فیصلے درست ہوں، تو ثواب ملے گا تو ثواب حال کرتے رہیں اور اس عمل کو جاری رہنا چاہیے۔

احقر کسی اور خدمت کا تو اہل نہیں، مختلف قسم کے عوارض اور موانع کی بنا پر معذور و مجبور ہے، مگر دعا خیر کے لیے حاضر ہے، اس لیے دعا ہی کو احقر نے اپنا وظیفہ اور معمول بنا رکھا ہے۔

(سلیم اللہ خان)

۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ/ ۱۲ فروری ۲۰۱۲ء

جامعہ فاروقیہ، کراچی

البرہان

حالات کی سنگینی اور علماء کرام کے خرابیٔ احوال کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا سلیم اللہ خاں جیسی فہیم اور مدبر شخصیت بھی مایوسی کا شکار نظر آتی ہے تاہم جیسا کہ خود مولانا نے فرمایا ہے کہ مایوسی کفر ہے کیونکہ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی جدوجہد اور کوشش ترک کر دیتا ہے جو کسی حال میں روا نہیں کیوں کہ ہم اسی کے مکلف ہیں، نتائج نکلیں نہ نکلیں کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا جہاں تک تدبیر بن پائے ہمارا کام اصلاح کے لیے کوشش کرتے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازیں۔

ہمارا دینی تناظر پروفیسر ملک محمد حسین ☆

علماءِ کرام کے درمیان اتحاد کی تجاویز

ماہنامہ 'البرہان' لاہور کے شمارہ ستمبر ۲۰۱۱ء میں محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب نے عنوانِ بالا پر نہایت ہی وقیع مضمون تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم ایک عرصہ سے بڑے تسلسل، بڑی تندہی ار بہت خلوص کے ساتھ علماءِ کرام کے درمیان اتحاد و اتفاق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ کا راقم ذاتی طور پر شاہد ہے۔ دینی مدارس کے نصابات کی ہم آہنگی کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور حد تو یہ ہے کہ مختلف مسالک کے علماء کرام نے اس سلسلہ میں تعاون اور توافق کا عملی اظہار بھی کیا ہے۔ ملی مجلس شرعی کے دو چار اجلاسوں میں اس درویش نے بھی شرکت کی اور جید علماءِ کرام کے خیالاتِ عالیہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا، جس سے میں نے یہ نتیجہ اُخذ کیا کہ اتحاد بین المسلمین کی خواہش اور تڑپ موجود ہے لیکن تاریخی عوامل اور عملی صورتِ حال مثبت اقدامات کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دینی مدارس اور ان کے محترم اساتذہ نے ذہنوں میں اتنا بُعد اور ملکی ماحول میں اتنی گرمی پیدا کر دی ہے کہ اب بزرگ علماء کی خواہش اور کوشش کے باوجود اُن کے ہزاروں، لاکھوں شاگرد اور لاکھوں کروڑوں مریدین و متاثرین اتحاد اور یک جہتی کی طرف نہیں آنے دیتے۔ پاکستان کا معاشرہ مکمل طور پر سکولرزم کی جکڑ میں آچکا ہے۔ حکمران کہتے ہیں اہل دین کو کارِ حکمرانی اور معاملاتِ جہاں بانی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور ادھر علماء کرام مختلف مسالک میں تقسیم ہونے کے باوجود اس مطالبے پر متحد و متفق ہیں کہ ہیئت اجتماعی اور آئینی مقتدرہ کی دینی اور درسی معاملات میں دخل اندازی کسی صورت قابل قبول نہیں۔

جناب ڈاکٹر محمد امین نے اختلاف بین العلماء والمسلمین کے حوالے سے اپنے مضمون میں جن عوامل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ درست اور قابل قدر ہے اور اس سلسلہ میں اُن کے خیالات ان کے گہرے مشاہدے اور تجربے کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن جو تجاویز موصوف نے پیش فرمائی ہیں وہ علماءِ کرام کے اتحاد کے سلسلہ میں شاید بارآور نہ ہوسکیں کیونکہ علماء کرام چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کرسکیں گے، وجہ تاریخی عوامل اور عملی صورتِ حال ہے جس کی تہہ میں ملکی، معاشی، سیاسی اور کسی حد تک

☆ ڈائریکٹر'الفوز انٹرنیشنل کالج، جوہرآباد

عالمی عوامل ہیں۔خوش قسمتی سے پاکستان کے حکومتی نہیں، ریاستی میکانزم میں ایسے آلات (Instruments) دستیاب ہیں جنہیں کام میں لاکر دینی حوالوں سے موجودہ انتشار وافتراق پر قابو پایا جاسکتا ہے اور قومی سطح پر دینِ اسلام اتحاد اور یک جہتی کا مظہر بنتے ہوئے غالب قوت کے طور پر اُبھر سکتا ہے۔

ہم دستورِ پاکستان میں اگر قرار دادِ مقاصد پر غور کریں، بنیادی حقوق سے متعلق آرٹیکلز کو بروئے کار لائیں، آئین کے آرٹیکل ۳۱ اور ۲۲۷ کو ان کی روح اور تقاضوں کے مطابق نافذ کریں نیز کراچی بدامنی کیس میں عدالت عظمیٰ کی بنیادی انسانی حقوق اور آئین کے مطابق قرآن حکیم کی تمام آیات و تعلیمات کا پاکستان کے آئین کا عملی حصہ ہونے کی ابزرویشن کو مدِنظر رکھیں تو پاکستان کی ریاست اور پاکستان کے ریاستی اداروں، جن میں اسلامی نظریاتی کونسل اور سپریم کورٹ آف پاکستان کو اساسی حیثیت ہے، کے ذریعے سے پوری یک جہتی کے ساتھ اسلام کے عملی نفاذ اور اتحاد بین المسلمین کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔اپنی تخلیق، وجہ تخلیق قرار دادِ مقاصد اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔اس اسلامی مملکت میں سیکولر خیالات اور سیکولر اقدامات کا تصور بھی ممکن نہیں، چاہے ایسے تصورات کا اظہار لبرل فاشسٹ کریں یا حکومتی کارندے۔اسی طرح علماء کرام کے اس خیال کو بھی سیکولرزم کو مضبوط کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا جائے گا کہ ریاست اور ہیئت مقتدرہ کو صلوٰۃ کے قیام، زکوٰۃ کے اہتمام اور معاملاتِ دین کو قرآن وسنت کی روشنی میں چلانے کا کوئی حق نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایک ریاست اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آچکی۔اس ریاست کا دستور العمل اسلام کے تقاضوں کے مطابق تشکیل پاچکا، اسلامی نظریاتی کونسل اور مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) موجود ہے۔انہیں دستور کے مطابق راہِ راست پر رکھنے کے لیے اب ایک آزاد عدالتِ عظمیٰ کا وجودِ مسعود میسر ہے۔قرآن وسنت کی تعلیمات اپنی اصلی شکل میں

موجود ہیں۔ ان تعلیمات کو صحیح تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کے لیے ملکی اور عالمی سطح پر علماء کرام کی ایک قابل قدر تعداد بھی موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دستور کے مطابق ریاستی ادارے حرکت میں آئیں اور تدریجاً کارِ اصلاح میں جُت جائیں۔ اگر ہم اسلام کی سربلندی کے لیے علماء کرام کے اتحاد کا انتظار کرتے رہے تو یہ کام قیامت تک نہ ہو سکے گا۔ اس کی پکڑ علماء کرام کو تو ہو گی لیکن ہم عام مسلمان اور حکمران بھی نہیں بچ سکیں گے۔

ہمارا دینی تناظر　　　**ڈاکٹر محمد امین**

جماعت اسلامی ـــ مستقبل کی مجوزہ حکمت عملی

'البرہان' کے جنوری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں ہمارا ایک مضمون 'نفاذ شریعت کی متبادل حکمت عملی...... سید مودودیؒ کے حلقۂ فکر کی خدمت میں چند گزارشات' شائع ہوا تھا جس کے جواب میں ہم نے فروری کے شمارے میں جماعت کے دو احباب کی طرف سے تبصرہ نما خطوط شائع کیے جن میں انہوں نے ہماری تحریر پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم اپنی تحریر میں کوئی واضح لائحہ عمل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ چنانچہ ہمیں اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کے لیے دوبارہ قلم اُٹھانا پڑا ہے۔ صلُب موضوع پر گفتگو سے پہلے دو باتیں تمہیداً عرض ہیں:

۱۔ ہم نے جان بوجھ کر اور عمداً جماعت کی مستقبل کی حکمت عملی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو نہیں کی تھی اور اپنے مضمون میں جماعت کے بانی اور فکری و عملی رہنما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے اس امر کا جواز ثابت کیا تھا کہ جماعت کو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور پاکستان میں اسلامی تبدیلی کے لیے محض سیاسی جدوجہد پر اکتفا کرنے کی بجائے اصلاح معاشرہ کو بنیاد بنا کر کام کرنا چاہیے اور اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ جماعت کے لوگ ماشاءاللہ پڑھے لکھے ہیں وہ اگر اس بنیادی بات کو تسلیم کر لیں تو اصلاح معاشرہ اور فرد کی تبدیلی کے لیے لائحہ عمل وہ خود وضع کر سکتے ہیں ـــ کیونکہ جماعت کے لیے مستقبل کی حکمت عملی طے کرنا بنیادی طور پر جماعت اور اس کی قیادت کی ذمہ داری اور استحقاق ہے اور ہم جیسے جماعتی نظم سے باہر بیٹھے ہوئے اس کے بہی خواہوں کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی تجاویز جماعت کے سامنے غور و فکر کے لیے رکھ دیں۔ اس تناظر میں ہم نے اپنی تجاویز کا محض ذکر کر

دیا اور اس کی تفصیلات پیش نہیں کیں ـــــ اس پر بعض جماعتی احباب کو غالباً تشنگی کا احساس ہوا اور ان کی یہ رائے بنی کہ ہم نے کوئی متبادل اور تفصیلی لائحہ عمل نہیں دیا۔

۲۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے دینی حلقوں میں یہ رجحان خاصا مستحکم ہے کہ وہ 'حق' کو اپنے مسلک اور مکتب فکر میں محدود اور محصور سمجھتے ہیں اور اپنے علاوہ باقی مسالک و مکاتب فکر کے حاملین کو اگر کافر و فاسق نہ بھی کہیں (اگرچہ ایسا سمجھنے والے بھی بہت ہیں) تو بھی انہیں غلط اور گمراہ تو سمجھتے ہی ہیں۔ تعصب و تحزب کی اس فضا میں وہ اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو برداشت نہیں کرتے اور اگر ہماری طرح کا کوئی شخص بڑے ادب کے ساتھ بھی کچھ گزارشات ان کی خدمت میں پیش کرے تو وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اور جو برداشت کر بھی لیں تو انہیں اس نئے نکتۂ نظر میں معانی اور حکمت و بصیرت نظر نہیں آتی اور وہ اپنی جماعت/تحریک/تنظیم کی پاپولر فکر کی مدافعت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس پس منظر میں اگر اللہ داد نظامی صاحب اپنی جماعت کے بانی کو 'سید العصر' قرار دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ان کی فکر عظیم تر، لاجواب اور حتمی ہے اور ان سے اختلاف کرنے والوں کی فکر مودودی صاحب کی فکری عظمت کے آفتاب کے سامنے دیے کی مانند ہیچ ہے تو ان کا موقف سمجھ میں آتا ہے۔ تقلید و جمود کی پچھلی چار صدیوں کے پیدا کردہ اس ماحول میں جماعتوں، تحریکوں اور مسلکوں کے قائدین کے متبعین کی اسی 'مریدانہ' ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی ہم نے خود سے نظریہ سازی کی بجائے اپنی رائے مولانا مودودی کے فکری موقف کی تائید کے ساتھ پیش کی تھی تاکہ جماعت کے لوگ اس پر ہمدردانہ غور کر سکیں ورنہ اہل علم جانتے ہیں کہ عہدِ رسالت، عہد صحابہ اور قرون اولیٰ میں اسلاف کا طرز عمل اس جامد مریدانہ ذہنیت پر مبنی نہیں تھا بلکہ وہاں فکری حریت کی فضا تھی مثلاً عہد رسالت میں دیکھیے کہ بدر کے میدان میں انتخاب کیمپ، احد میں جنگی حکمت عملی، احزاب میں مال کے عوض یہودیوں کے شر سے بچاؤ، حدیبیہ میں بظاہر کافروں سے دب کر صلح جیسے بے شمار واقعات میں صحابہ کرامؓ نے سرور کائنات، ختم الرسل، مہبط وحی اور کائنات کے عظیم ترین انسان اور بزرگ ترین دانشور (**فداہ ابی و امی و علیہ آلاف الصلاۃ و السلام**) سے اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ نے لشکر اسامہ کے بھیجنے، جمع قرآن اور مانعین زکوٰۃ سے جنگ میں حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف کیا اور خود حضرت عمرؓ کو ایک خاتون نے ایک پبلک اجتماع میں مہر کے تعین کے سلسلے میں برسرعام ٹوک دیا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ جملہ تو اہل علم میں معروف ہے کہ "**نحن رجال وھم رجال**" یعنی قرآن وسنت وقول صحابی کے بعد جہاں تک حق اجتہاد کا تعلق ہے تو آپ نے بڑے بڑے تابعین کا نام لے کر کہا کہ جس طرح انہیں حق اجتہاد حاصل ہے ہمیں بھی ہے۔ اور شیخین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد تو بات بات پر اپنے عظیم استاذ سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں اور امام شافعی کا یہ قول انسانی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ میں اپنے مخالف کے قول کو غلط سمجھتا ہوں

لیکن اس میں صحت کا امکان تسلیم کرتا ہوں اور اپنے موقف کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس میں غلطی کا امکان تسلیم کرتا ہوں ـــــ کیونکہ یہ بزرگ سمجھتے تھے کہ ان کا قول قرآن کا حرف نہیں بلکہ اجتہادی رائے ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے اور دوسرے کی رائے ان کے مقابلے میں صحیح بھی ہوسکتی ہے ـــــ لیکن آج کل یہ طرز عمل لوگوں کے ہاں خصوصاً مذہبی لوگوں کے ہاں اجنبی بن چکا ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں کہ طویل ہوگئی، ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے مضمون میں جو استدلال پیش کیا تھا، اسے ہم بعض وضاحتوں کے ساتھ دہراتے ہیں تاکہ ہمارا موقف منقح اور مزید واضح ہو کر البرہان کے قارئین اور جماعتی احباب کے سامنے آ جائے تاکہ وہ اس کے حسن و قبح پر غور کرسکیں۔

۱۔ اقامت دین کا عام فہم مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں اور یہ کہ معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت بھی اسی مقصد کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔

۲۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں 'اسلامی ریاست کیسے قائم ہوتی ہے؟' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا کہ اسلامی ریاست قائم کرنے کا فطری طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی ذہن سازی کی جائے، ان کے اندر اسلامی نظام زندگی کی پیاس اور تڑپ پیدا کی جائے تاکہ انقلاب امامت کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے جو ریاستی قوت کو زندگی کے سارے شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کے لیے استعمال کریں۔

۳۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بن گیا تو تحریک پاکستان میں جو دوقومی نظریے کی اساس، 'پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ' کے نعرے، لیگی قیادت کے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے بار بار کے اعلانات اور عوام کی طرف سے ان کی پذیرائی نے ایک ایسی فضا قائم کردی جس کے نتیجے میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ قوم اور اس کی قیادت ریاست کے اسلامی کردار پر یکسو ہوگئی ہے۔ اس لیے مولانا مودودیؒ نے ترجمان القرآن میں لکھا کہ جماعت سیاسی جدوجہد کر کے کوشش کرے گی کہ پاکستان عملاً ایک اسلامی ریاست بن جائے ـــــ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوسکا تو ہم اسلامی ریاست بذریعہ اصلاح معاشرہ کے اس منہاج کی طرف واپس لوٹ جائیں گے جو اسلامی ریاست کے قیام کا فطری طریقہ ہے (یہ بحث اب 'اسلامی ریاست' نامی کتاب کے آخری صفحات میں موجود ہے)۔

۴۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی زندگی میں پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لیے بحیثیت امیر جماعت جو جدوجہد کی وہ انقلاب امامت بذریعہ سیاسی جدوجہد ہی کے موقف پر مبنی تھی لیکن

یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری حصے میں اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اختیار کردہ حکمت عملی پاکستان کو عملاً ایک اسلامی ریاست بنانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی چنانچہ اس کا تحریری اظہار انہوں نے مولانا سید وصی مظہر ندویؒ حیدر آبادی کے نام خط میں کیا (جو مطبوعہ موجود ہے) جس میں مولانا نے کہا تھا کہ میری عمر اور صحت اب اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں نئے سرے سے اور نئے انداز میں کام کی ابتداء کر سکوں البتہ میری تحریروں میں اس کی طرف رہنمائی موجود ہے اور اس کا زبانی اظہار انہوں نے جماعت کی شوریٰ میں بھی کیا اور مولانا سید اسعد گیلانی مرحوم سے ذاتی ملاقات میں بھی کیا جس کا تذکرہ گیلانی صاحب مرحوم نے راقم الحروف سے کیا تھا۔

۵۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ خود فکر مودودیؒ کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت اپنی حکمت عملی اور طریق کار پر نظر ثانی کرے۔ اس نظر ثانی کا تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جماعت براہ راست سیاسی جدوجہد کے ذریعے انقلاب امامت کا کام کچھ وقت (مثلاً پندرہ بیس سال کے لیے) معطل کر دے اور اصلاح معاشرہ اور فرد کی تربیت و خدمت کے کام پر اپنی ساری قوتیں صرف کر دے تا کہ اس کے نتیجے میں عوام کی خواہش اور ارادے سے ایک فطری انداز میں ایک ماڈل اسلامی ریاست وجود میں آنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ لیکن ہم نے کہا تھا کہ شائد یہ آسان نہ ہو اور جماعت کی سیاسی جدوجہد کے بلاشبہ کچھ فائدے اور حاصلات بھی ہیں گو اسے شاید کامیابی نہیں ملی۔ اس لیے ہم نے ایک درمیانی راستہ تجویز کرتے ہوئے 'تقسیمِ کار' کا اصول پیش کیا تھا جس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ جماعت اپنا ایک سیاسی ونگ، محاذ یا جماعت کسی دوسرے نام سے قائم کر دے جو سیاسی جدوجہد کرے (جیسا کہ حال ہی میں مصر میں الاخوان المسلمون نے کیا ہے) اور خود دعوت و اصلاح، تعلیم و تربیت اور خدمت خلق کے ذریعے فرد اور معاشرے کی اصلاح اور خدمت کی سرگرمیوں کو منظم کرے۔

۶۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ آج یہ فیصلہ کرنا نہ جماعت کی قیادت کے لیے آسان ہے اور نہ کارکنوں کے لیے۔ یہ فیصلہ ۱۹۴۷ء میں کرنا آسان تھا خصوصاً مولانا مودودیؒ جیسے صاحب فکر اور صاحب الرائے سکالر کے لیے اور وہ اس پر اپنے ساتھیوں کو مطمئن اور رضامند بھی کر سکتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جب جماعت نے پاکستان میں براہ راست سیاسی جدوجہد کے ذریعے انقلاب امامت اور قیام نظام اسلامی کی جدوجہد کو اپنا ہدف اور نصب العین بنایا تو اس کے لیے دلائل کی عمارت کھڑی کرنا بھی ایک فکری ضرورت اور نظریاتی تقاضا تھا چنانچہ اس پر ایک پورا 'علم الکلام'☆ وجود میں آیا جس نے اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد کو دینی فریضہ قرار دے کر ایک گونہ تقدس عطا کیا۔ موجودہ قیادت اور کارکن اسی ذہنی اور فکری فضا میں پروان چڑھے ہیں لہٰذا انہیں ہماری بات نامانوس اور غیر منطقی لگ سکتی ہے اور بظاہر اقامت دین کی اس 'ہمہ گیر' تعبیر کے خلاف محسوس ہو سکتی ہے جو ان کے نزدیک دین

کی صحیح تعبیر ہے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اگر وہ جماعتی انداز کے مخصوص طرزِ فکر سے اوپر اٹھ کر سوچ سکیں اور دین کے مآخذ اور سپرٹ پر غور کریں تو وہ بھی ہماری طرح اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ پورے دین کی بات نہیں بلکہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے حکمت عملی اور طریق کار کی بات ہے جس پر نظر ثانی ہوسکتی ہے اور جسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا صحیح تناظر کیا ہے؟ سطور ذیل میں ہم اس کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

۱.۶۔ جس نظریۂ حیات کو ہم مانتے ہیں اسے لانے والے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس پر

☆ ہم یہ الفاظ یا اصطلاح خدانخواستہ بطور طنز یا برے معنوں میں استعمال نہیں کر رہے بلکہ اس سے ہماری مراد ہے اس موضوع پر دینی تعلیمات کو ابھار کر سامنے لانا، اصرار سے پیش کرنا، انہیں بار بار مختلف طریقوں اور اسالیب سے دہرانا اور نمایاں کرنا۔

نازل ہونے والی کتاب (قرآن حکیم) نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی جس میں نہ ہم اپنی مرضی سے آتے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے جاتے ہیں، ایک خالق نے بنائی ہے جو اس کا مالک وحکم اور رب ہے، ہم اس کے حقیر عبد ہیں اور وہ ہمارا آقا ومولا ہے۔ ہمارا کام اس کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس کی بڑائی تسلیم کرتے ہوئے اس کے آگے جھکیں (عبادت) اور دنیا کی زندگی اس کے احکام کے مطابق گزاریں (اطاعت)۔ پیغمبر اللہ اس لیے مبعوث فرماتا ہے کہ وہ اس کی مرضیات ہم تک پہنچائے، نمونے کی زندگی گزار کر ہمیں دکھائے اور صحیح تعلیم وتربیت سے ہمارے نفوس کی ایسی تربیت کرے کہ اللہ کی عبادت واطاعت کا رویہ ہمارے لیے سہل ہوجائے اور ہم اس کی خوشنودی ورضا حاصل کرسکیں۔ اللہ کی عبادت واطاعت کی یہ ذمہ داری انسان کی انفرادی ذمہ داری ہے اور وہ بحیثیت فرد ہی اللہ کے سامنے اس کے لیے جواب دہ ہوگا اور اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا کا مستحق ٹھہرے گا لیکن انسان چوں کہ اس دنیا میں اکیلا نہیں رہتا بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر بستیوں اور شہروں میں ایک معاشرہ بنا کر رہتا ہے اس لیے یہ معاشرہ اس کے فکر وعمل پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا ایک فرد کے راہ راست پر رہنے اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ پورا معاشرہ اس ہدف میں اس کا معاون ہو اور اس کی مزاحمت نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں بنیادی اہمیت اس امر کو حاصل ہے کہ فرد کی تعلیم وتربیت صحیح ہو تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت پر مبنی زندگی گزارنے کے قابل ہوسکے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں بتایا ہے کہ وہ پیغمبر اسی لیے مبعوث کرتا رہا ہے کہ وہ صحیح تعلیم وتربیت سے لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرے تاکہ وہ اللہ کی عبادت وطاعت کی زندگی گزار سکیں اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کریں کہ پورا معاشرہ اسی راستے پر چل نکلے تاکہ فرد کے لیے اس راہ پر چلنے میں آسانی ہوجائے۔

۶.۲ ـ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی قرار دیا اور انہیں قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کے لیے ہادی و رہبر بنایا، اس لیے اس نے نہ صرف قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ لیا بلکہ بالواسطہ طور پر نبی کی سنت اور مسلم معاشرے کی بقاء کا سامان بھی کیا تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے بات مشتبہ نہ رہے کہ حق کیا ہے بلکہ قرآن وسنت اور امت کا اجماع وتعامل ہمیشہ ان کے لیے مشعل راہ بنا رہے لہٰذا دین کیا ہے اور اس کی ترجیحات کیا ہیں؟ یہ بات امت مسلمہ میں کوئی راز نہیں اور نہ یہ امر امت کے اہل علم پر مخفی یا مشتبہ یا مختلف فیہ رہا ہے بلکہ اس پر وہ ہمیشہ متفق رہے ہیں ـ ان کا اختلاف صرف فروعی اور اجتہادی امور میں ہے جو نہ صرف فطری ہے بلکہ وسعت و لچک رکھنے کی وجہ سے مفید بھی ہے الّا یہ کہ ہم میں سے کوئی اپنی حماقت سے فروعات کو اساسات جتنی اہمیت دینے لگے یا اساس کی کسی اپنی تشریح میں حق کو محصور سمجھنے لگے ـ

۶.۳ ـ اللہ تعالیٰ نے جب نبوت کا دروازہ بند کر دیا تو آخری نبی کی امت کو ذمہ دار بنا دیا کہ وہ حق پر خود بھی عمل کرے اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائے اور اگر مسلم معاشرے کے افراد میں دین پر عمل کے حوالے سے کوتاہی و کمزوری دیکھے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرے ـ یہ عمل شرعی اصلاح میں دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہلاتا ہے ـ اصلاح کی یہ ذمہ داری فرد اور معاشرے دونوں پر محیط ہے ـ بنیادی تو فرد ہے کہ وہی اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ کو جواب دہ ہے اور معاشرہ بھی افراد ہی سے مل کر بنتا ہے لیکن معاشرے اور ریاست میں اگر خرابی اور کمزوری آ جائے تو ان کی اصلاح بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اگر ان میں کمزوری آ گئی تو وہ اپنا مقصد وجود پورا نہیں کر سکیں گے جو اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ فرد کی اللہ کی راہ پر چلنے میں معاونت کریں ـ

۷ ـ خلاصہ یہ کہ اس امر کی خواہش و کوشش، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی (یعنی ادارہ یا جماعت بنا کر) کہ مسلم حکمران ایسے ہوں جو اپنے فرائض ٹھیک شرعی تقاضوں کے مطابق ادا کریں یا مسلمانوں کو یہ بات سمجھانا کہ وہ ایسے حکمرانوں کو چنیں جو اسلامی مقاصد کے لیے اور اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کریں یا ایسے حکمرانوں کی اصلاح جو غیر اسلامی انداز میں کام کر رہے ہوں —— ان سارے کاموں کا شرعی تناظر یا شرعی جواز دعوت واصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی ہے ـ اور 'سیاسی اصلاح' کا یہ کام پورے دین کی دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ہمہ گیر کام کا ایک جزو ہے کیونکہ سیاست دین کے بے شمار شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے، لیکن مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی پیدا کردہ لادین جمہوریت کو معمولی کتر بیونت کے بعد 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے کی اجتہادی غلطی [1] یا مجبوری، اور قیام پاکستان کے بعد جماعت کے اس فیصلے نے کہ لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام لانے کے لیے وہ 'اصلاح معاشرہ' کی بجائے، سیاسی جدوجہد کا راستہ اختیار کرے گی...... ان دو امور نے جماعت

کے لوگوں کو ’داعی‘ اور ’مصلح‘ کی بجائے ’سیاسی کارکن‘ بنا دیا اور ان کی اخلاقی ساکھ اور معیار بھی متاثر ہوا ہے (جو داعی کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے) لہٰذا اب اگر جماعت کی فہیم قیادت ہماری ’تقسیم کار‘ کی تجویز کو قبول کرتی ہے تو اسے فکری سطح پر کارکنوں کی تربیت کے لیے ایک نیا علم الکلام (۲) ترتیب دینا ہوگا اور پوری کوشش، محنت اور توجہ سے جماعت کے کارکنوں میں دعوتی کلچر از سرنو پروان چڑھانا ہوگا کیونکہ اگر یہ نہ کیا گیا تو جماعت کی

۱۔ دیکھیے البرہان جنوری ۲۰۱۲ء میں ہمارا مضمون ’مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت بنانے کا تجربہ اور اس کے نتائج‘۔

۲۔ مطلب یہ کہ دعوت و تبلیغ کی ضرورت، دعوت میں فرد کی اہمیت اور الاقرب فالاقرب اور نیچے سے اوپر کی ترتیب کا لحاظ، تربیت و تزکیہ کی اہمیت، ذکر و نوافل پر اصرار، جدید اور دینی تعلیم کی اہمیت، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کا دینی کردار، خدمت خلق کی اہمیت اور غریبوں، مظلوموں اور دبے ہوئے طبقات کی دست رسی...... وغیرہ کی شرعی حیثیت اجاگر کرنا اور دین میں ان کی اہمیت واضح کرنا۔

دینی اساس اور اخلاقی ساکھ مزید کمزور اور مجروح ہو جائے گی جو کہ ظاہر ہے غیر مطلوب ہے اور جس کا ایک مظاہرہ محترم قاضی حسین احمد صاحب کے دور امارت میں ہو چکا ہے جب انہوں نے اسلامک فرنٹ بنایا تھا اور مصر، تیونس اور ترکی وغیرہ میں بھی سامنے آ رہا ہے کہ سیاسی کامیابی کے لیے وہاں دینی مطالبات اور تقاضوں کا دودھ پتلا ہو کر ’لسی‘ بن رہا ہے۔ اس لیے ہم اگر تقسیم کار کی تجویز پیش کر رہے ہیں تو زور دے کر یہ بات کہیں گے کہ اگر نئی سیاسی جماعت یا ونگ بنایا جائے تو باقی ساری جماعت کو دعوت و اصلاح کے اس پرانے کلچر کی طرف واپس لانے کے لیے بھرپور منصوبہ بندی اور محنت کی جائے جو قیام پاکستان سے پہلے جماعت کے کارکنوں کا طرۂ امتیاز تھا، ورنہ یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔

محترم ڈاکٹر انیس احمد صاحب نے بھی عالمی ترجمان القرآن (شمارہ جنوری و مارچ ۲۰۱۲ء) میں عالم عرب خصوصاً مصر (جو اخوان کا بنیادی مرکز ہے) کے تجربات سے استفادے کی بات کی ہے اور اس میں ہرج بھی کوئی نہیں جیسا کہ تقسیم کار اور سیاسی ونگ بنانے کے حوالے سے خود ہم نے ذکر کیا ہے تاہم طریق کار اور نتائج کے حوالے سے جو فرق دونوں خطوں کی تحریکوں میں ہے اسے بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے مثلاً ایک تو یہ کہ وہاں جدید اسلامی تحریکوں کو آمروں کے ظلم و جبر کا سامنا کرنا پڑا اور عوام برسوں ان کی مظلومیت اور ایثار و قربانی ملاحظہ کرتے رہے۔ اس سے فطری طور پر تحریک کو عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔ دوسرے سیاسی سرگرمیوں کا موقع نہ ملنے کی بناء پر انہیں دعوت و خدمت خلق کے مواقع میسر آ گئے۔ اس سے انہیں دینی لحاظ سے لوگوں کے قریب آنے، ان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے اور ان کی خدمت سے مرجع خلائق بننے کا موقع مل گیا۔ پاکستان میں جماعت اسلامی ان نعمتوں سے بڑی حد تک محروم رہی ہے اور اسے سیاسی میدان میں کام کرنے کا طویل موقع ملا ہے۔ لیکن اس میں

بوجوہ اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی ☆۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ دینی حلقوں کی مخالفت نے جن کا گہرا اثر پاکستانی معاشرے پر ہے (خصوصاً مسجد، مدرسے اور عوام کے دینی رسوم ورواج میں شرکت ورہنمائی کی وجہ سے......اور ان شعبوں میں جماعت کا کام نہ ہونے کے برابر ہے) پاکستان میں جماعت اسلامی کو ایک متبادل اور قابل قبول مذہبی قوت کے طور پر ابھرنے نہیں دیا اور اس کے اثرات شہروں، قصبوں کی متوسط طبقے کی پڑھی لکھی محدود آبادی تک سکڑ کر رہ گئے ہیں۔

۸۔ جماعت کے دینی اور سیاسی لحاظ سے بہت موثر اور کامیاب نہ ہو پانے کے ساتھ ساتھ اگر ہم عمومی طور پر پاکستانی معاشرے کے اسلامی مستقبل پر غور کریں تو پریشان کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ جماعت کے ساتھ دوسری دینی سیاسی جماعتیں بھی کامیاب نہیں ہوسکیں اور مستقبل کے بارے میں، غیب کا علم

☆ ہم یہاں اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے ورنہ موضوع سے دور ہٹ جائیں گے۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن بظاہر جو حالات ہیں ان میں جماعت یا کسی دوسری دینی سیاسی جماعت کے کامیاب ہوکر ریاستی قوت کو غلبۂ اسلام کے لیے استعمال کرنے کے امکانات مستقبل قریب میں دُور دُور تک نظر نہیں آتے۔

دوسری طرف دنیا میں غالب مغربی تہذیب جو اصلاً وحی کی سیادت کی منکر اور خدا سے بغاوت کی داعی ہے، یہود وہنود سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی فکر اور اداروں (لادینی جمہوریت، نظام سرمایہ داری، سیکولرزم، وغیرہ) کے ساتھ مسلم معاشرے خصوصاً پاکستان پر حملہ آور ہوچکی ہے اور اسے مقامی حکومتوں اور اداروں کی سرگرم حمایت (طوعاً او کرھاً) حاصل ہے اور اس کا سیلاب ہماری معاشرتی قدروں اور دینی اصولوں کو بہائے لیے چلا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ جماعت سے وابستہ لوگوں کے تعلیمی اداروں کی بہت بڑی اکثریت بھی مغربی فکر وتہذیب کو فروغ دے رہی ہے اور بہت سے افراد کی معیشت ومعاشرت بھی اس سیلاب کی نذر ہوچکی ہے ـــ تو پھر ہمارے معاشرے کا اسلامی مستقبل کیا ہے؟ اور ہمارے لیے متبادل مناسب راہ عمل کیا ہے؟

ہماری رائے یہ ہے کہ اصل ہدف تو اسلامی تبدیلی لانا ہے یعنی یہ کہ مسلم معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل ہونے لگے اور اگر آپ انقلاب امامت اور سیاسی ذرائع سے یہ تبدیلی نہیں لاسکے تو 'سماجی منہاج' کے ذریعے یہ تبدیلی لانے کی کوشش کرنے میں آخر حرج کیا ہے؟ سماجی تبدیلی کے ہم دو بڑے ذرائع تجویز کرتے ہیں۔ ایک اصلاح فرد (ومعاشرہ) بذریعہ دعوت وتبلیغ، جدید اور دینی تعلیم، تربیت وتزکیہ، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا اور گلی محلے کی سطح پر اخلاقی ماحول مہیا کر کے اور

دوسرے خدمت خلق یعنی غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد اور پسے ہوئے، دبے ہوئے، مظلوم اور مجبور و مقہور لوگوں کی دست رسی کر کے، انہیں تعلیم اور علاج کی سہولت دے کر، انہیں امن وانصاف مہیا کر کے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سارے کام سماجی سطح پر متحد و منظم ہو کر بڑی حد تک کیے جا سکتے ہیں اور اس میں سیکولر حکومتوں کی مزاحمت کم ہو گی کیونکہ اس میں ان کے اقتدار کو فوری اور براہ راست کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اصلاح وخدمت کی اس طرح کی تحریک خاموشی سے اسلامی تبدیلی کی راہ ہموار کر سکتی ہے جیسا کہ ترکی میں سعید نورسی کے بعد فتح اللہ گولن کی تحریک نے کیا ہے۔ ترکی اور الجزائر میں بلدیاتی سطح پر عوام کی خدمت نے کیا ہے۔ مصر، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش میں اس کے وسیع اور موثر اثرات موجود ہیں تو آخر پاکستان ہی میں یہ کام کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

۹۔ اصلاح وخدمت کی مجوزہ تحریک کا تفصیلی لائحہ عمل یا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ ہم اس پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ البرہان کے موجودہ شمارے میں بھی اس پر ایک تفصیلی مضمون 'آیئے! اس معاشرے کو بدل دیں' موجود ہے۔ اسی موضوع پر البرہان کے شمارہ ستمبر ۲۰۱۱ء میں دیکھیے ہمارا مضمون 'دینی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت' اور شمارہ نومبر ۲۰۱۱ء میں 'پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں۔ ناکامی کے اسباب اور کامیابی کا لائحۂ عمل' لہٰذا ہم اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔

۱۰۔ ہمارے بھائی اللہ داد نظامی صاحب خاطر جمع رکھیں۔ ہمیں الخدمت اور جماعت کی رفاہی سرگرمیوں کا بخوبی علم ہے لیکن ہم اصلاح وخدمت کی جس تحریک کی بات کر رہے ہیں اگر وہ اس کے تناظر اور اہداف کو سمجھ لیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ انقلاب امامت کے سیاسی ہدف کے لیے کچھ تعلیمی یا سماجی فلاح کے کام کرنا معاشرے میں سماجی تبدیلی کے لیے اصلاح وخدمت کی وسیع اور ہمہ گیر تحریک چلانے سے مختلف معانی رکھتا ہے۔

۱۱۔ اور ہم یہ جو بات کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلام لانے کے لیے سیاسی طریق کار کی بجائے یا اس کے ساتھ ساتھ سماجی منہاج کو اوّلین ترجیح بنایا جائے، یہ کوئی کفر و اسلام اور حق و باطل کی بات نہیں ہے محض ترجیحات یا حکمت عملی کی تبدیلی کی بات ہے۔ بلکہ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ سیاسی اصلاح کے لیے کام کرنے کا ایک ہی اسلوب نہیں ہے کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے اور حصول اقتدار کے لیے مسلم حکمرانوں کا حریفانہ مقابلہ کیا جائے بلکہ سیاسی اصلاح کی بیسیوں صورتیں ہو سکتی ہیں اور سب شرعی لحاظ سے مقبول ہیں۔ دور کیوں جایئے برصغیر کی مثال لے لیجیے! ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علامہ محمد اقبال نے جو سیاسی کردار ادا کیا اس کے اثرات آج بھی ہماری قومی

زندگی پر نمایاں نظر آتے ہیں لیکن دونوں نے معروف معنوں میں فعال سیاسی زندگی نہیں گزاری۔ ہمارے اسلاف میں سے بھی اکثر نے اس طرح کی سیاسی جدوجہد نہیں کی جس کے بغیر آج بعض لوگ دین کا تصور ہی نہیں کر سکتے لیکن ان میں سے ہر ایک نے دین کے کسی نے کسی شعبے (مثلاً دعوت وتبلیغ، تربیت وتزکیہ، خدمت خلق وغیرہ) میں کام کیا ہے اور مسلم فرد اور معاشرے کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دینے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے اور خدانخواستہ ہم ان میں سے کسی کی بھی تنقیص نہیں کر سکتے۔ اسی کو ہم آج کی اصلاح میں اصلاح وخدمت کا منہج یا سماجی تبدیلی کا منہج کہہ رہے ہیں۔

برادرم نظامی صاحب نے جو بات کی کہ فلاں فلاں نبی حکمران گزرے ہیں۔ وہ خود انہی کے خلاف جاتی ہے کیونکہ حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث فرمائے اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے صرف تین چار کے حکمران بننے کا ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے دو چار کے باقی سارے پیغمبروں کو اقتدار نہیں ملا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک اور صحیح حدیث ہے کہ قیامت کے روز جم غفیر بہت کم پیغمبروں کے ساتھ ہوگا اور بعض کے ساتھ تو محض چند آدمی ہوں گے لیکن اس کے باوجود ظاہر ہے سارے پیغمبر کامیاب ہوئے کیونکہ اگر معاشرے نے ان کا ساتھ نہیں دیا، حق کو قبول نہیں کیا اور حق معاشرے پر غالب نہیں آیا تو اس میں ان کا کیا قصور؟

تاہم یہ محض خلط مبحث ہے کیونکہ ہمیں اس میں نظامی صاحب یا جماعت سے کوئی اختلاف نہیں کہ اسلام ایک دین ہے جو سارے شعبۂ ہائے حیات کے بارے میں ہماری رہنمائی فرماتا ہے اور اس کا یہ مطالبہ اور تقاضا ہے کہ زندگی کے سارے شعبوں میں دینی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ مسلمان حکمران اگر اس میں اپنے حصے کا کام نہ کریں تو وہ غلط ہیں، ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ ضروری ہے تاہم سیاست صرف دین کا ایک شعبہ ہے۔ ہم باقی شعبوں میں کیوں دینی کام نہ کریں اور ہاتھ توڑ کے کیوں بیٹھ رہیں؟

اصل میں ہم جماعت، دینی عناصر اور قوم کی توجہ جس امر کی طرف مبذول کرا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ چلیے دینی سیاسی جماعتیں کامیاب نہیں ہوسکیں، سوال یہ ہے کہ دین کے دوسرے (غیر سیاسی) شعبوں میں...... اور وہ بیسیوں ہیں...... ہمارے علماء، دینی عناصر (مدارس، مساجد، جماعتیں، تحریکیں، ادارے) اور سول سوسائٹی کے دین دار لوگ کیوں کام نہیں کرتے؟ یہ لاکھوں لوگ ہیں اگر متحرک ہوجائیں، منظم ہوجائیں، متحد ہوجائیں تو معاشرے کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور فرد اور معاشرے میں اسلامی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں بڑی حد تک اسلام آ سکتا ہے اور بغیر اقتدار کے آ سکتا ہے لیکن ہم خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں اور مغرب کی لادین تہذیب کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں لیکن آنکھیں کھولنے کے لیے اور ہاتھ پیر چلانے کے لیے تیار نہیں؟

۱۲۔ **تلخیص بحث:** ہم دین کے ایک طالب علم اور جماعت کے ایک خیر خواہ کی حیثیت سے

جماعت کو یہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ مستقبل میں دینی جدوجہد کی حکمت عملی کی تبدیلی پر غور کرے اور مصر کے اخوان کی طرح سیاسی جدوجہد کے لیے اپنا سیاسی ونگ یا جماعت بنائے اور باقی ساری جماعت اور اس کے کارکن فرد اور معاشرے کی اصلاح و خدمت کے لیے (اسلامی تناظر میں، مغربی فکر و تہذیب کو رد کرتے ہوئے) کام کریں جیسا کہ قیام پاکستان سے پہلے وہ کر رہے تھے۔ اس کی رہنمائی مولانا مودودیؒ کی فکر اور تحریروں میں موجود ہے اور یہ بھی عین دینی کام ہے، دین کی اقامت ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہ محض کام کی حکمت عملی تبدیل کرنا ہے، اپنے کسی موقف سے انحراف نہیں ہے۔

۱۳۔ امید ہے برادرم اللہ داد نظامی صاحب اور عبداللہ صاحب (پشاور) پر ہمارا نقطۂ نظر واضح ہو گیا ہوگا تاہم انہیں حق ہے کہ وہ ہم سے اختلاف کریں، سیاسی جدوجہد سے تبدیلی لانے کے منہاج پر قائم رہیں اور انہیں اگر ہمارے اشعار میں معنی نظر نہیں آتے تو نہ سہی، وہ تقسیم کار اور سماجی تبدیلی کے ہمارے نظریے کو رد کر سکتے ہیں۔ ہماری ایک رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اگر دلائل رکھتے ہیں اور اس پر مطمئن ہیں تو اس میں بھی کوئی مضایقہ نہیں؟ ہم اس اختلاف کے باوجود بھائی اور دوست ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے۔

تبادلۂ خیال میں تو کوئی ہرج نہیں لیکن مناظرے کے ہم قائل نہیں، خواہ زبانی ہو یا تحریری، کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سوائے الفاظ کی جادوگری یا گولہ باری کے اور فریق مخالف کو ہرانے کے جذبے کے اور ایسے عبث کاموں کے لیے نہ ہمارے پاس وقت ہے اور نہ ہم اس کا مزاج اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

میڈیا طیبہ ضیاء

ایجنسیوں اور غیروں کے ہاتھ بِکے ہوئے میڈیا کا احتساب کون کرے گا؟

بعض ٹی وی چینلز اور اینکر پرسنز کے بارے میں افواہیں چلتی رہتی ہیں کہ کس نے کتنے ڈالر لیے اور کون کس کے پے رول پر ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا لیکن جن چینلز اور اینکرز کی پالیسیاں اسلام اور پاکستان کی بجائے امریکہ اور بھارت اور ان کی تہذیب و ثقافت کے حق میں ہیں ان کے خلاف اس سے بڑھ کر ثبوت کی ضرورت بھی کیا ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا احتساب کون کرے؟ کیا وہ حکمران جو سر تا پا غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہیں یا وہ سیاست دان جن کے نزدیک فحاشی اور عریانی کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ جہاں تک عوام اور اسلامی قوتوں کا تعلق ہے تو وہ خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں۔ امین

سابق صدر غلام اسحاق خاں کے الیکشن سیل کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) رفاقت خان نے ۵۶ لاکھ روپے میں صحافیوں کی وفاداریاں خریدیں۔ سب جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے چلے آرہے ہیں۔ ایک بیوروکریٹ نے کسی صحافی کی کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ فلاں نے سی ایس ایس کا امتحان دیا، کامیاب نہ ہوسکا تو کسی کالج میں لیکچرار لگ گیا، اس نے کسی اخبار میں بھی لکھنا شروع کردیا۔ قسمت اچھی تھی کہ اس اخبار کا ٹی وی چینل بھی شروع ہوگیا اور اس کو اینکری مل گئی۔ وہ لیکچرار بیوروکریٹ تو نہ بن سکا مگر آج جب بیوروکریٹ اور سیاست دان اس سے ڈرتے ہیں تو اس کے اندر چھپے ایک ناکام بیوروکریٹ کو روحانی تسکین ملتی ہے۔ یہ ایک صحافی کی کہانی نہیں بلکہ ایک بیمار معاشرے کی تصویر کشی ہے جس میں دوسروں کو تو آئینہ دکھایا جاتا ہے مگر اس میں اپنا چہرہ دیکھنے کا حوصلہ پیدا نہیں کیا جاتا۔ صحافت کی دنیا بھی شرمناک کہانیوں سے بھری پڑی ہے مگر بے نقاب کرنے والا کوئی نہیں کہ الا ماشاء اللہ قلم اور زبانیں ''سولڈ'' ہیں۔ ظاہری اور خفیہ ہاتھوں سے پیسے ہی نہیں گاڑیاں، پلاٹ اور دیگر پُرتعیش مراعات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ عوام سیاست دانوں کے خلاف کرپشن کی کہانیاں سُن کر سیخ پا ہوجاتے ہیں مگر بدنام صحافیوں کے ٹی وی شوز اور کالموں کا بائیکاٹ نہیں کرتے۔ صحافی ابھی تک احتساب کے عمل سے بچے ہوئے ہیں۔ صحافیوں کو ہر دور حکومت میں استثنیٰ حاصل رہا ہے۔ صحافیوں کی یہ قسم سیاست کی دنیا میں ''گیم چینج'' کرنے میں مہارت رکھتی ہے۔

اسلام اور مغرب

محمد زاہد صدیق مغل

سائنسی علمیت اور اسلام

حامیان سائنس مسلم مفکرین کے دلائل کا جائزہ

مقصد مضمون

ماہنامہ الشریعہ مئی ۲۰۰۸ میں راقم الحروف کا مضمون 'سرمایہ دارانہ یا سائنسی علمیت: ایک تعارف' شائع ہوا۔ اولاً راقم الحروف کا ارادہ تھا کہ اصل مضمون میں سائنس کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان دلائل کا مختصر جائزہ بھی پیش کردیا جائے جنہیں مسلم حامیان سائنس ایک عرصے سے دہراتے چلے آرہے ہیں، لیکن خوف طوالت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس سیکشن کو حذف کردیا گیا۔ عدیم الفرصتی کے سبب یہ تحریر مؤخر ہوتی رہی۔ لیکن حال ہی میں ماہنامہ البرہان میں سائنس و ٹیکنالوجی پر جاری بحث نے

ایک بار پھر راقم کو اس موضوع پر اپنے خیالات مربوط انداز میں پیش کرنے کا داعیہ فراہم کر دیا۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے حامیین ایک عرصے سے مخصوص طرز فکر اور دلائل کی بنیاد پر سائنس کی اسلام کاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس مضمون میں ہم اسی مخصوص طرز فکر کے صغری و کبری (grand narratives) کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ ان حضرات کے دلائل کا جواب بھی سامنے آ جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس عمومی فکر کی کمزوریاں بھی واضح ہو جائیں۔ ہم ماہنامہ البرہان کے شکر گزار ہیں کہ اس کے مضامین نے ہمیں یہ گزارشات پیش کرنے کا موقع دیا۔ اپنی انتہائی کوشش کے برعکس مضمون ذرا طویل ہو گیا ہے جسکے لئے معذرت کا طلب گار ہوں، لیکن بنیادی مباحث کی تفہیم کیلئے یہ تطویل ضروری تھی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ تمام مسلم حامیان سائنس کے بارے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ وہ سب کے سب مخلص اور اسلام کا درد رکھنے والے حضرات ہیں نیز ہمارے درمیان بنیادی فرق نظریات (theories) کا ہے ایمانیات (beliefs) کا نہیں۔

حامیان سائنس مفکرین کے دلائل کا خلاصہ

سائنس کو اسلامیانے کے لیے مسلم مفکرین کی کل کائنات درج ذیل مفروضات ہیں:

(۱) سائنس و ٹیکنالوجی ایک ایسا غیر اقداری علم ہے جو تمام انسانی تہذیبوں میں تحلیل ہوتا ہوا اپنا تاریخی سفر طے کر کے موجودہ منطقی منزل تک آ پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک علم ایک مسلسل تاریخی عمل (Historical progression) کا نام ہے جو کسی قسم کی ایمانیات کا مرہون منت نہیں ہوتا۔

(۲) سائنس کے نقصانات بذات خود سائنسی علمیت کی نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ سائنسی ترقی ان علاقوں میں پروان چڑھی جہاں لوگ مذہب اسلام کی اصل تعلیمات سے بہرور نہ تھے لہٰذا یہ تمام سائنسی علمیت وحی سے علی الرغم انسانی عقل و خواہشات کے زیر اثر پروان چڑھتی رہی اور یوں اس کے نتیجے میں یہ انسانیت کے لیے باعث زحمت بن گئی۔ اگر اہل مذہب خصوصاً مسلمان آگے بڑھ کر سائنس کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لیں تو سائنس ابر رحمت برسانے لگے گی

(۳) سائنس اور مذہب خصوصاً اسلام کے درمیان تعلق مخاصمت (conflict) کا نہیں بلکہ مفاہمت (complementarity) کا ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے موید و مددگار ہیں، خصوصاً آج کے دور میں تو سائنس حقانیت اسلام ثابت کرنے کا ناگزیر ذریعہ ہے، نیز اسلام اور سائنس کبھی باہم مخالف ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ سائنس اسی حقیقت کی تلاش میں ہے جسے اسلام حقیقت کہتا ہے

(۴) آج اگر سائنس اور مذہب کے درمیان مخاصمت نظر آتی ہے تو اسکی وجہ کلیسا کا ناعاقبت اندیشانہ رویہ تھا اور کلیسا کے اس رویے کی وجہ عیسائی علمیت کی کمزوری تھی جو سائنس کے آگے کھڑی نہیں

ہوسکتی تھی۔ اس کے برعکس چونکہ اسلام نہ صرف یہ کہ سائنسی تحقیقات کے خلاف نہیں بلکہ اسکا زبردست حامی وبانی ہے، لہٰذا اسلام اور سائنس میں جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

(۵) اگر سائنسی ترقی کو غلط سمجھتے ہوئے مسلمان اس سے دامن چھڑا لیں تو پھر غلبۂ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا سورج کہاں سے طلوع ہوگا؟ نیز کفار کے مقابلے کیلئے قوت کیسے فراہم ہوسکے گی؟

یہ ہے مسلم حامیان سائنس کی فکر اور دلائل کا مکمل ڈھانچہ جس کا اظہار مختلف مفکرین کے ہاں مختلف اسالیب (shades and varities) میں ملتا ہے۔ ان دلائل پر کلام کرنے سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سائنس پر تنقید کر کے ہم کوئی نیا کام نہیں کر رہے بلکہ اس فکری سلسلے کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی داغ بیل امام غزالیؒ نے یونانی فکر کا محاکمہ فرما کر ڈالی تھی۔ موجودہ مغربی فکر درحقیقت یونانی فکر ہی کا نتیجہ (off-shoot) ہے (۱) جس کا ظہور اسلامی تاریخ میں معتزلہ کی صورت میں ہوا تھا۔ یونانی فکر وحی سے علی الرغم انسانی کلیات کے ذریعے ادراک حقیقت کے امکان کا دعوی کرتی تھی اور یہی دعوی موجودہ سائنس کا ہے کہ ادراک حقیقت کیلئے کسی وحی کی ضرورت نہیں، انسان خود حقیقت جان سکتا ہے (معتزلہ اسی لئے یہ کہتے تھے کہ اصلاً شارع عقل ہے، خیر و شر شارع کے حکم سے ماوراء مستقل تصورات ہیں، نیز وحی کیلئے لازم ہے کہ وہ عقل انسانی کی تصویب و تصدیق کرے، عدل کرنا خدا پر لازم ہے وغیرہ وغیرہ)۔ اگر امام صاحبؒ معتزلہ کے زیر اثر پروان چڑھنے والے یونانی فکر کے سحر کا پردہ چاک نہ فرماتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ جو گمراہی یورپ میں ایک ہزار سال بعد نشاۃ ثانیہ کے نام پر فروغ پائی اس کا سہرا اسلامی دنیا کے حصے میں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین امام غزالیؒ کا ذکر اپنی تاریخ کے تسلسل میں بطور مجرم (villan) کرتے ہیں، جبکہ ان کے نزدیک ان کا سب سے بڑا محسن مسلم فلسفی ابن رشدؒ ہے جس نے امام صاحب کی کتاب **تہافۃ الفلاسفۃ** کا جواب لکھ کر یونانی فکر کے مردے میں گویا پھر سے روح پھونک دی۔ جدیدیت پسند مسلم فلاسفہ بھی عموماً امام صاحبؒ کے ناقدین کی صفوں میں نظر آتے ہیں جسکی مثال خطبات اقبالؒ کے 'خطبہ علم' میں سب سے واضح انداز میں ملتی ہے (۲)۔ اسلامی اور عیسائی تاریخ میں فرق یہی ہے کہ عیسائیوں کو کوئی امام غزالیؒ نصیب نہ ہوا جو جدید فکر کا محاکمہ کر کے اس فتنے کو زمین بوس کر دیتا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم مسلم مفکرین سے چند اصولی سوالات کرنا چاہتے ہیں: اولاً علم کیا ہے؟ کیا ہر علم کی مابعد الطبیعیات ہوتی ہے یا نہیں؟ دوئم ان کا تصور سائنس کیا ہے، یعنی وہ کس شے کو سائنس کہتے ہیں؟ ظاہر بات ہے جب تک یہ طے نہ ہوجائے کہ 'علم کیا ہے' اور 'سائنس کیا ہے' ہر بحث لا حاصل رہے گی کیونکہ اکثر و اوقات دوران بحث دو افراد ایک ہی اصطلاح کو مختلف معنی میں استعمال کرنے کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہوجاتے ہیں۔ حامیان سائنس مفکرین عموماً اپنے مضامین میں ان

سوالوں پر کوئی سطر تحریر نہیں فرماتے اور وہ علم اور سائنس کو کسی معلوم شے (for granted) کے طور پر لیتے ہیں۔ مسلم مفکرین سائنس پر بحث کرتے ہوئے کسی علمی منہج (epistemological discourse) کا نہ تو حوالہ دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے دلائل کسی علمیاتی منہج پر قائم کرتے ہیں بلکہ ان کے تمام تر دلائل مغربی فکر میں اسلامی پیوند کاری (adhocism and grafting) کا شاخسانہ ہوتے ہیں اور یہی ان کی فکر کی سب سے بنیادی کمزوری ہے۔ اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ سائنسی مضامین پر تنقید کرنے والے صاحب کی فلسفہ سائنس پر نظر ہی نہیں ہوتی اور وہ سائنس کا کوئی خود ساختہ مفہوم ذہن میں سمائے ہوتے ہیں۔ ہم اس سائنس کی مخالفت کرتے ہیں جو مقتدر مغربی فلاسفہ کے ہاں مسلمہ طور پر سائنس سمجھی جاتی ہے اور جسے scientism کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے 'تشکیل حیات انسانی کے لئے وحی کو رد کر کے حصول علم کے لیے انسانی کلیات کو بنیاد بنانا اور حقیقت کو ویسا بنانے کی کوشش کرنا جیسا کہ انسان چاہتا ہے یعنی کائناتی قوتوں پر ارادہ انسانی کا تسلط قائم کرنے کی جستجو'، اسکے علاوہ سائنس اور کسی شے کا نام نہیں۔ وہ شخص جو فی زمانہ جاہلیت سے واقف نہ ہو اس پر حضرت عمرؓ کا قول صادق آتا ہے کہ جو شخص جاہلیت کو نہیں جانتا وہ اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا۔ اسلام کو ہر دور میں چند مخصوص مسائل کا سامنا ہوتا ہے اور دور حاضر کا بڑا مسئلہ سرمایہ داری کا غلبہ ہے۔ چنانچہ جو شخص ان مسائل کی حقیقت جانے بغیر ہی ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کر کے تفہیم اسلام کی کوشش کرتا ہے وہ بالعموم غلط نتیجے تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ہم مسلم مفکرین کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ا۔ علمیت اور مابعد الطبیعیاتی تناظر نظر انداز کرنے کی غلطی

سائنس کے بارے میں یہ دعوی کہ سائنسی علم ایک مسلسل تاریخی عمل ہے اپنے اندر دو مستقل مفروضات سموئے ہوا ہے، اولاً تاریخیت (historicism) دوم سائنس کی غیر اقداریت (value-neutrality) کا اثبات۔ یہاں مسئلہ تاریخیت پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں البتہ یہ دعوی کہ سائنس ہر انسانی تہذیب وتمدن میں موجود رہی ہے ایک بے بنیاد مفروضہ ہے کیونکہ جس شے کو سائنس اور سائنٹفک میتھڈ کہتے ہیں وہ تو سولہویں اور سترہویں صدی کی پیداوار ہے، اس سے پہلے اگر ایسی کوئی علمی روایت موجود تھی جس کا مقصد ارادہ انسانی کا تسلط ہو اور ایسا کوئی institutionalized scientific mechanism موجود تھا جہاں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا مقصد انسانی زندگی کو طویل اور پر لطف بنانے کے طریقے دریافت کرنا رہا ہو تو اس کا ثبوت پیش کیا جانا چاہیے۔ مسلم مفکرین کے دعووں کے برخلاف درجنوں مغربی مصنفین تفصیل کے ساتھ ان وجوہات کا ذکر کرتے ہیں جو پہلے ادوار میں سائنس کی تشکیل وفروغ میں مانع رہے تھے (۳)۔

مزید یہ کہ سائنس کی تاریخیت پر حامیان سائنس بذات خود خلفشار کا شکار ہیں، یعنی ایک طرف تو وہ یہ دعوی فرماتے ہیں کہ سائنس مسلسل تاریخی عمل ہے اور دوسری طرف ان کا خیال یہ ہے کہ سائنس قرآن کی عطا ہے۔ مثلاً علامہ اقبالؒ کے خیال میں اسلام تو آیا ہی سائنسی ترقی کے لئے تھا لیکن مسلمان قرآن کی اصل روح یعنی حصول علم کے لیے تجربیت (empiricism) پر زور کو نہ سمجھ سکے اور معتزلہ کے زیر اثر یونانی عقلیت (rationalism) کی بھول بھلیوں کا شکار ہو کر سائنس سے دور جا پہنچے۔ علامہ اقبالؒ کے شاگرد ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے یہ دعوی بھی کیا ہے کہ رسالت م آبؐ سے پہلے سائنس کا وجود نہ تھا، گویا دنیا میں سائنس سرسید اور انگریزوں کی مشترکہ اصطلاح میں (Muhammadans) لے کر آئے۔ امت محمدیہؐ سے پہلے پوری دنیا تاریکی اور جہالت میں تھی کیونکہ قرآن نازل نہیں ہوا تھا اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کے بغیر علم طبیعیات، علم حیاتیات اور علم نفسیات برآمد نہیں ہوسکتا تھا۔ رفیع الدین صاحب کے اس خیال کی ترجمانی ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اپنے محاضرات قرآنی میں یوں کی ہے کہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے بنی نوع انسانیت کے مظاہر قدرت (مثلاً آگ، چاند، سورج وغیرھم) کی پرستش میں مبتلا ہونے کی وجہ ان اشیاء کے بارے میں ان کا تصور تقدیس تھا جس کے پیچھے ان مظاہر قدرت سے حاصل ہونے والے فوائد اور مافوق الفطرت اثرات تھے۔ چنانچہ یہ حضرات دعوی کرتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں قرآن وہ پہلی کتاب ہے کہ جس نے انسان کو یہ بتایا کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ انسان کے فائدے، استعمال اور خدمت کی خاطر اس کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے اس اعلان نے مظاہر قدرت کے بارے میں پائے جانے والی تقدیس کی تمام غلط فہمیوں کی جڑ کاٹ کر ان کی تحقیق و تسخیر کے امکان کی راہ ہموار کی اور یہ بات سائنسی ذہنیت پیدا کرنے کے ضمن میں قرآن کی بہت بڑی عطا ہے۔ حامیان سائنس سے ہمارا سوال یہ ہے کہ سائنس کی تاریخیت کے بارے میں ان کا کونسا دعوی درست ہے، یہ کہ سائنس قرآن کی عطا ہے یا یہ کہ سائنس مسلسل انسانی تاریخی عمل ہے؟ پھر یہ دعوی کہ سائنسی ذہنیت قرآن کی عطا ہے اپنے اندر یہ مضمرات لئے ہوئے ہے کہ نبی علیہ السلام سے پہلے اللہ کی طرف سے ایک لاکھ سے زائد انبیاء کرام اور بے شمار کتب اور صحف جو اس دنیا میں بھیجے گئے انہوں نے انسانوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ تمام مظاہر قدرت تمہاری ہی طرح اللہ کی مخلوقات ہیں جنہیں تمہاری خدمت پر معمور کیا گیا ہے۔ کیا کسی مسلمان کے لیے اس بات کا تصور کرنا ممکن ہے کہ گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں انسان کا اس کے خالق اور کائنات کے ساتھ تعلق جیسی بنیادی باتیں بھی شامل نہیں ہوا کرتی تھیں؟ اگر انبیاء کرام نے یہ تعلیمات نہیں دی تھیں تو وہ لوگوں کو اور کون سے عقائد کی تعلیم دیتے تھے؟ قرآن تو واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو شرک سے منع کیا اور اللہ کی عبادت کا حکم دیا (انبیاء ۲۱: ۲۵)۔ اس دعوے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لاکھ تیئیس ہزار نو سو ننانوے انبیاء ان علوم کے بغیر آئے لیکن اس کے باوجود یہ دنیا چلتی رہی اور نعوذ باللہ ان کے دور اندھیرے اور جاہلیت کے دور تھے کیونکہ سائنسی طریقہ

علم ایجاد نہ ہوا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر واقعی سائنس قرآن کی عطا ہے تو مغرب نے سائنسی ترقی قرآن پڑھے بغیر کیسے کر ڈالی؟

سائنسی علمیت کو مابعد طبیعیاتی تبدیلی کی مرہون منت ماننے کے بجائے مسلسل تاریخی عمل کہنا عجیب تر تصور ہے۔ اس مفروضے کا مطلب یہ ہوا کہ پندھرویں صدی عیسوی تک ساری انسانی تاریخ جہالت و اندھیروں کی تاریخ ہے جیسا کہ ہیگل، کومٹے، مارکس اور دیگر ایسے فلسفیوں کا خیال ہے جو تاریخیت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو سائنسی کامیابی انسان ہزاروں سال میں حاصل نہ کر سکا ایک خاص زمانے کے بعد محیر العقول رفتار سے وقوع پزیر ہونے لگی۔ کیا تسلسل اسی شے کا نام ہے؟ اسکے مقابلے میں یہ تصور کہ سائنسی علمیت ایک مخصوص مابعد الطبیعیاتی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے مقاصد زندگی کے حصول کو ممکن بنانے والی علمیت ہے نہ صرف یہ کہ تاریخی حقائق کے عین مطابق ہے بلکہ عقلی طور پر بھی قابل فہم ہے۔ فیئرابینڈ (Feyerabend) اور اس کے ہم نوا پس جدیدی فلاسفۂ سائنس مغربی ممالک میں سائنس کی ریاستی سرپرستی کے سخت خلاف ہیں کیونکہ مغرب میں سیکولرزم اور آزادی کے نام پر مذہب اور ریاست کو الگ کر دیا گیا ہے مگر ریاست اور سائنس لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں یعنی وہ سرپرستی جو پہلے ریاست مذہبی علم کی تعمیر کے لیے کرتی تھی اب سائنس کے لیے کرتی ہے (۴)۔ سرپرستی کی اس نوعیت کی تبدیلی درحقیقت کسی عقلی بنیاد پر نہیں بلکہ اُن مخصوص حالات کی مرہون منت ہے جو مغرب میں سترہویں صدی میں پیش آئے جس کے نتیجے میں لوگوں کے تصورات حق و باطل، خیر و شر، کامیابی اور ناکامی، عدل و ظلم، علم و جہالت سب میں یکسر تبدیلی آئی اور انسانیت کے جہاز کا سفر اخروی نجات سے ہٹا کر دنیاوی عیش و عشرت، تسخیر و اصلاح نفس و قلب کے بجائے تسخیر کائنات کی منزل کی طرف موڑ دیا گیا۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ مغربی سائنس درحقیقت مقاصد کی انہی تبدیلیوں کے باعث پیدا ہونے والا ایک نیا طریقۂ علم تھا جو ان نئے قسم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس مخصوص تبدیلی کے بعد سائنس یکا یک غالب آ گئی، کیونکہ آج سائنس جس عروج پر دکھائی دیتی ہے اس کے پیچھے استعماری دور میں ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت و نسل کشی کی ایک خوفناک داستان ہے جس کے بعد ہی جدیدی فکر کا غلبہ ممکن ہو سکا ہے (۵)۔ نیز اگر آج ہمیں اپنے اردگرد سائنس پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہے تو اس کے پیچھے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی ذہنی صلاحیتیں کارفرما ہیں جنہوں نے شعوری و غیر شعوری طور پر انہی اہداف کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے جسے سائنس 'کامیاب زندگی' کے طور پر پیش کرتی ہے۔ پھر ان کروڑوں افراد کی صلاحیتوں کو نتیجہ خیز (integrate) کرنے کے لیے آزاد مارکیٹ پر مبنی سرمایہ دارانہ معاشی نظام درکار ہے۔ یہ موبائل فون جسے ہم اور آپ اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں آزاد مارکیٹ پر مبنی ایک مکمل نظام سے گزرنے کے بعد اس منزل تک پہنچتا ہے۔ اسکی مثال سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے جیسے پاکستان

میں فٹ بال وغیرہ کے اچھے کھلاڑی اس لئے سامنے نہیں آتے کیونکہ ہمارے یہاں وہ نظام مفقود ہے جو فٹ بال کھیلنے والوں کی صلاحیتوں کو نکھار کر سامنے لا سکے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کی عدم موجودگی میں سائنس کا ہرا بھرا درخت کبھی پھل دار نہیں ہوسکتا (اس نکتے کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

سائنس کو تاریخی تسلسل ماننے کے بعد دوسرا بحث طلب مفروضہ سائنس کی غیر اقداریت کا دعوی ہے۔ مسلم مفکرین کی تحریروں میں سائنس کو ایک غیر اقداری علم تصور کر کے اسے نوع انسانی کی میراث فرض کرلیا جاتا ہے، یعنی ان کے خیال میں سائنس کا کسی مخصوص مابعد الطبیعیات سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں، گویا سائنسی علم تمام تر مقاصد انسانی سے ماوراء کہیں سے آ گیا ہے اور اب مسئلہ صرف اس کے صحیح اور غلط استعمال کا ہے۔ ظاہر ہے علمی طور پر سائنس کے بارے میں یہ تصور ایک فکری خلفشار (conceptual error) ہے کیونکہ مابعد الطبیعیات کے بغیر علم کا تصور ہی محال ہے اور فلسفے کا ہر ادنی طالب علم اس بات سے بخوبی واقف ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ انسانی فکر کی بنیادی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی ہے:

۱) مابعد الطبیعیاتی حقائق پر ایمان (یعنی ہر فکر بشمول مذہب حقیقت کی بابت چند مخصوص ایمانیات پر قائم ہوتی ہے)۔

۲) تصور علمیت (ان مابعد الطبیعیاتی ایمانیات سے علم کا مخصوص تصور نکلتا ہے جو ان سوالوں کا جواب دیتا ہے کہ علم کیا ہے، علم کہاں سے ملے گا اور اس کے درست ہونے کا معیار کیا ہے)۔

۳) تصور اخلاقیات (پھر اس مخصوص تصور علم سے خیر و شر کا مخصوص تصور ابھرتا ہے)

آسان لفظوں میں اس کی تشریح یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، پھر اس حقیقت کو جاننے کا ذریعہ تلاش کرتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ بتاتا ہے کہ خیر اور شر کیا ہے۔ یہ سوال کہ 'علم کیا ہے' اس کا کوئی جواب دینا ہی ممکن نہیں جب تک مابعد الطبیعیاتی مفروضات (mataphysical presumptions) طے نہ ہو جائیں۔ 'کیا ہے' کو معلوم کرنا ہی علمیت کا بنیادی سوال ہے (۶)، ماہیت علم اور اس کی درجہ بندی کا تعین 'معلوم' (object of knowledge) کے تصور سے طے پاتا ہے، یعنی 'کس مجموعہ معلومات' پر لفظ علم کا اطلاق کیا جائے گا اس کا تعلق براہ راست 'knowledge of what' (کس شے کا علم) کے تصور سے ہے مثلاً اسلامی تصور علم میں علم سے مراد معرفت الٰہی اور اسکا حاصل خشیت الٰہی کا حصول ہے جیسا کہ آیت **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** (یعنی اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں، فاطر ۳۵: ۲۸) سے واضح ہے، اسکے مقابلے میں سائنسی علمیت میں خدا اور خشیت الٰہی کا کوئی حوالہ سرے سے موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مجموعہ معلومات کسی ایک مابعد الطبیعیاتی تناظر میں علم کہلاتا

ہے جبکہ کسی دوسری مابعدالطبیعات میں جہالت قرار پاتا ہے اور یہی حالت تصور اخلاق کی بھی ہے۔ علم اور مابعدالطبیعیات کے اس بنیادی تعلق سے حامیان سائنس یکسر سہو نظر فرماتے ہیں۔ اگر وہ واقعی سائنس کو 'علم' سمجھتے ہیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ لازماً اس کی کچھ نہ کچھ مابعدالطبیعیات ہوگی، کیا یہ حضرات کچھ وضاحت فرمائیں گے کہ وہ مابعدالطبعیاتی تناظر کیا ہے جس سے ان کے خیال میں سائنس برآمد ہوئی؟ کیا اس تناظر میں خدا، وحی اور آخرت کا کوئی تصور موجود ہے؟ اور اگر سائنس کا کوئی مابعدالطبیعیاتی تناظر نہیں ہے تو پھر اسے علم کہنا ایک خلط مبحث (confusion) کے سواء اور کچھ نہیں۔ اس بات کا اقرار کیا جائے گا کہ سائنس کی کوئی مابعدالطبیعیات ہے۔ یہ دعوی خود بخود رد ہو جائے گا کہ سائنس مسلسل تاریخی عمل کا نتیجہ اور غیر اقداری علم ہے۔ سائنس کو انسانی تاریخ کا مسلسل عمل قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کے اظہار کا کوئی دائرہ ایسا بھی ہے جو ہر قسم کی مابعدالطبیعیات سے ماوراء ہے، ظاہر ہے علمی طور پر یہ ایک غلط دعوی ہے کیونکہ انسانی معاشروں میں ایسا کوئی 'طبعی قانون' کارفرما نہیں ہوتا جو ہر قسم کے انسانی مقاصد سے ماوراء ہو، یعنی انسانی معاشرہ طبعی کائنات (physical world) کی مانند نہیں جہاں انسانی ارادے و مقصد سے ماوراء بھی چند قوانین نافذ ہیں (۷)۔

سائنس کو ہر قسم کی مابعدالطبیعیات سے ماوراء تصور کرنے کی غلط فہمی کے پیچھے یہ مفروضہ کارفرما ہوتا ہے کہ سائنس تو اشیاء و موجودات 'جیسی وہ ہیں' (thing in itself) کو بیان کرتی ہے۔ یہاں اس مفروضے پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں کیونکہ کانٹ (Kant, 1724-1804) کے بعد سائنس کے بارے میں یہ بات کم از کم کسی فلسفی نے کہنے کی جرات نہیں کی کہ سائنس کسی حقیقت کی تلاش کرتی ہے یا یہ کہ سائنس اشیاء و موجودات کی ہر قسم کی مقصدیت سے ماوراء حقیقت کا اظہار ہے۔ کانٹ سے پہلے فلسفے اور سائنس میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ حقیقت انسان سے باہر اور معین شے ہے (reality is out there and fixed) اور انسان اپنے کلیات کے ذریعے 'حقیقت جیسی کہ وہ ہے' اسے جان سکتا ہے۔ لیکن کانٹ نے بتایا کہ اگر حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہی تجربہ ہے تو پھر علم اور سائنس ممکن ہی نہیں کیونکہ انسانی تجربے سے ماوراء حقیقت کے بارے میں یہ فرض کرنا کہ وہ معین ہے دعوی بلا دلیل ہے، یعنی جب بیرونی دنیا کا علم ہی تجربے سے ممکن ہے تو پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ جس شے کا تجربہ ہو رہا ہے وہ میرے تجربے سے ماقبل ایک معین شے ہے؟ جو بنیادی بات کانٹ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ درحقیقت بیرونی کائنات کا نہیں بلکہ انسانی ذات کا نظام معین ہے بصورت دیگر سائنسی علم کی آفاقیت کی کوئی توجیہہ ممکن ہی نہیں۔ سائنسی علم کی توجیہہ کے لیے کانٹ نے یہ تصور پیش کیا کہ انسانی ذات (self) کے اندر ایسا نظام (structure) اور ترتیب (order) موجود ہے جو انسانی تجربے کو ہیئت (form) اور معنی (meaning) فراہم کرتا ہے، ذات کے اس اندرونی نظام کے بغیر تجربہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ کائنات اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتی، جب ذات کے اندر موجود نظام کو اس پر مسلط کیا جاتا ہے تو اس میں معنی پیدا

ہوتے ہیں۔ مثلاً ذات کے پاس ایک تصور مکان و زمان کا ہے اور ایسا ہی ایک تصور مقدار (quantity) کا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شے ہو لیکن وہ زمان و مکان میں نہ ہو یا اسکی کوئی مقدار نہ ہو بصورت دیگر وہ ہمارے احاطہ علم میں نہیں آئے گی، کانٹ کے مطابق امکان علم کے لیے زمان و مکان اور اس جیسے دیگر تصورات کا وجود ذات میں ماننا لازم ہے۔ الغرض کائنات کو ایک معقول کائنات کے طور پر سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے ذات کے نظام کے ذریعے سمجھا جائے، یعنی تعقل، معانی، ربط وضبط، نظام زندگی ہر چیز کا منبع انسانی ذات ہے اور اس منبع نور کے علاوہ علم کا اور کوئی ذریعہ نہیں (۸)۔ کانٹ کے نزدیک ذات کی اس صلاحیت پر ایمان لانے کے بعد ہم ایسے عمومی اصول وقوانین وضع کر سکتے ہیں جو آفاقی ہوں، اس کے لئے کسی شریعت کی ضرورت نہیں۔ انسانی ذات کے نظام کو درست طریقے سے استعمال کرکے (جسے scientific method کہتے ہیں) ایسا مثالی اور عادلانہ معاشرہ ترتیب دینا ممکن ہے جسے کانٹ Kingdom of Ends سے تعبیر کرتا ہے، جہاں ریاست ہر فرد کا یہ اختیار تسلیم کرلے کہ وہ خود مختار (autonomous) اور قائم بالذات (self-determined) ہے، جہاں ہر شخص اس بات کا تعین کر سکے گا کہ وہ کیسی زندگی گزارے گا یعنی جہاں ہر شخص کیلئے خیر وشر کی تعیین اور اپنے ارادے کی تکمیل ممکن ہو سکے گی۔ گو کہ کانٹ نے عقلیت (rationalism) اور تجربیت (empiricism) کے مابین جاری بحث میں مفاہمت (reconciliation) پیدا کردی لیکن اس نے حقیقت کی تلاش کو حقیقت کی تخلیق کے سانچے میں ڈھال دیا، یعنی سائنسی علم کی توجیہہ ومقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ حقیقت کی تخلیق ٹھہرتی ہے۔ کانٹ کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ سائنسی علم کا مقصد کائنات پر ارادہ انسانی کو مسلط کرنا ہے، یعنی حقیقت کو ویسا بنانا ہے جیسا کہ 'میں' چاہتا ہوں کیونکہ نظام ومعنی 'انسانی ذات' میں ہیں نہ کہ کائنات میں۔ اسی بات کو مارکس زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہتا ہے کہ the point in scientific knowledge is not to know the world, but to change it، یعنی سائنسی علم کا مطمع نظر دنیا کو جاننا نہیں بلکہ اسے تبدیل کردینا ہے۔ اسی طرح ماضی قریب کے بڑے فلسفی ہائیڈیگر نے یہی بات ٹیکنالوجی کے بارے میں بھی واضح کردی کہ ٹیکنالوجی کوئی غیر اقداری شے نہیں جسے جو شخص جیسے چاہے مرضی استعمال کرلے بلکہ ہر ٹیکنالوجی ایک مخصوص مقصدیت کو ممکن بناتی ہے اور موجودہ ٹیکنالوجی کا مقصد اشیاء وموجودات کو انسانی ارادے کے تابع بنانا ہے جس کے لئے وہ 'standing reserve' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے (۹)۔ کائناتی قوتوں پر انسانی ارادے کو مسلط کرکے ارادہ انسانی کی تکمیل ہی سائنس کا اصل مقصد ہے، یہی بات پچھلے مضمون میں کہی گئی تھی اور یہاں اسکی تصویب فلسفے کے بڑے مفکرین کے خیالات سے بیان کردی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ تمام بحثیں ثقیل ہیں مگر انہیں سمجھے بغیر سائنس پر کچھ بھی کہنا محض عجلت پسندی کی علامت ہے۔ کون کہتا ہے کہ Bio-engineering اور Genetics وغیرہ کی فیلڈ میں ہونے والی تحقیقات کا مقصد کسی حقیقت کو

تلاش کرنا ہے، یہاں تو ایسی حقیقت تخلیق کرنے کا جنون سوار ہے جیسی خود انسان کو مطلوب ہے (۱۰)۔ سائنس کا مقصد ارادہ انسانی کا تسلط ہے یہ بات تقریباً ہر سائنسی مضمون کی درسی کتاب کے پہلے باب میں Explanation-Prediction-Control Model کے نام سے تحریر ہوتی ہے، یعنی سائنسی طریقہ کار کا مقصد حوادت کی ایسی تفہیم حاصل کرنا ہے کہ ان کی پیشین گوئی کرنا اور انہیں انسان کے قابو میں لانا ممکن ہو سکے۔ یہ سمجھنا کہ سائنس کا مطلب ہر مقصدیت سے ماوراء چیزوں کو جاننا ہے فکری خلفشار ہے کیونکہ کسی شے کے جاننے کے عمل کو مقصدیت سے جدا کرنا ہی محال ہے، ایک ہی شے پر دو مختلف مقاصد کے تحت غور کرنے سے دو مختلف نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ کیا سائنس کی تباہ کاریوں پر مبنی تین سو سالہ تاریخ کے بعد بھی اس دعوے کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ سائنس ایک مخصوص مقصد کے تحت غور و فکر کرنے کا نام ہے؟

سائنس کو تاریخی تسلسل ثابت کرنے کیلئے یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ نئے دور کی ایجادات پہلے کے مقابلے میں بہتر ہوتی ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس دلیل میں 'بہتری' (improvement) سے کیا مراد ہے؟ سائنس اور سرمایہ داری کی دنیا میں بہتری ماپنے کا معیار efficiency (کم سے کم لاگت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار) اور accumulation of capital (سرمائے کی بڑھوتری) ہے، ہر وہ تحقیق اور ایجاد جو ان مقاصد کو ممکن بناتی ہو وہی بہتر تصور کی جاتی ہے۔ گھوڑے گاڑی سے لیکر کار اور جہاز کا سفر اسی لئے بہتری تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اسکے نتیجے میں سرمائے کی ایک جگہ سے دوسری جگہ تیز تر ترسیل ممکن ہو گئی ہے، ورنہ کئی دوسرے معیارات سے گھوڑا اور گدھا کار کے مقابلے میں زیادہ بہتر سواری کا نظام فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً گھوڑے، اونٹ وغیرہ کی سواری کا کمال یہ تھا کہ یہ سواری ہر سال دو چار بچے بھی دیتی تھی اور اسی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو اپنی سواری مستعار دینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے اور اس کی انشورنس بھی نہیں کرائی جاتی تھی۔ اس میں پٹرول ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، اردگرد موجود زرعی زمینوں اور چراگاہوں سے اس کی خوراک کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ اس سواری کا سفر اتنا سستا تھا کہ اس پر بیٹھ کر امام بخاریؒ نے کئی ممالک کا سفر کیا۔ اگر یہ سواری ضائع ہو جاتی تو دوسری سواری خریدنا ناممکن نہیں ہوتا تھا۔ اگر سواری میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا تو اس سواری کو ذبح کر کے کھا لیا جاتا۔ یہ سواری کسی قسم کی ماحولیاتی آلودگی کا باعث نہیں تھی اس کا گوبر تک کھاد کے کام آتا تھا، اس سواری کی دیکھ بھال کے لیے ایسے بڑے بڑے ورکشاپ کھولنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی جہاں بیٹھے ہوئے کارندے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہوں، مالک اس سواری کے کل پرزوں کو اور طریقہ کار کو جان سکتا تھا اور جانتا تھا وہ اس کی خوبیوں خرابیوں سے واقف ہوتا تھا اور اسے درست کرنے اور درست رکھنے کے لیے اسے سات سمندر پار سے ماہرین، بروشر، ٹیکنالوجی ایکسپرٹ اور ہزاروں قسم کے مختلف ماہرین کی ضرورت نہ تھی۔

پھراس سواری کا سب سے بڑا فائدہ انسان کا صحت مند وجود تھا۔گھوڑے کی پیٹھ پر پندرہ کلومیٹر سفر کرنے کے بعد نہ کسی کو حملۂ قلب ہوتا تھا، نہ بلڈ پریشر بڑھتا تھا، نہ شوگر ہوتی تھی، نہ سونے کے لیے نیند کی گولیاں کھانی پڑتی تھیں اور نہ جسم میں طرح طرح کے درد نکلتے جو آج کل کے پیٹ بھروں اور آرام پسندوں کو لاحق ہوگئے ہیں۔ چونکہ سواری کو خوراک مہیا کرنے کے لیے انسان اپنے ارگرد درختوں، زرعی زمینوں اور چراگاہوں کا خاص خیال رکھتا تھا لہٰذا فطری اور قدرتی ماحول ہر طرف برقرار رہتا تھا اور انسان سیر و تفریح کے لیے شہر سے باہر فارم ہاؤس اور واٹر پارک نہیں جاتا تھا کہ وہاں جا کر سبزہ گھاس درخت، پھل پھول دیکھ کر خوش ہو اور خوشی کے یہ چند لمحات بھی پندرہ بیس ہزار روپے ادا کرنے کے بعد نصیب ہوں۔ اس عہد کا ہر شخص فارم ہاؤس میں رہتا تھا لہذا فارم ہاؤس کے دھندے نہیں تھے۔ یہ اس عہد کی بات ہے جو فطرت سے ہم آہنگ عہد تھا اور اب کاروں کا عہد ہے جہاں کہنے کو بے شمار سواریاں موجود ہیں مگر کوئی سواری لاکھوں سے کم نہیں۔ یہ خصوصیات جو قدیم سواریوں کو میسر تھیں کیا اس سواری کو میسر ہیں جسے کار کہتے ہیں؟ بتایئے کیا سائنس وٹیکنالوجی کے ماہرین ان معیارات پر کار کا موازنہ گھوڑے اور اونٹ گاڑی سے کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟ درحقیقت 'تصور بہتری' ایک مابعداطبیعیاتی تصور ہے جسکا معیار ایمانیات سے طے پاتا ہے، سائنسی ایجادات کو کسی 'مجرد تصور بہتری' کے اعتبار سے بہتر کہنا ایک لایعنی دعوی ہے، انہیں کسی بھی درجے میں بہتر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سائنس کے 'تصور بہتری' کو حق مان لیں۔'اشیاء میں بہتری' کو دلیل بنا کر سائنس کو مسلسل تاریخی عمل ثابت کرنے کے پیچھے یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ سائنسی تصور بہتری ہی حق ہے نیز یہ تمام انسانی تہذیبوں میں جلوہ فروز رہا ہے، ظاہر ہے اسلامی علمیت اور انسانی تاریخ اس مفروضے کو کلیتاً رد کرتی ہیں، اگر اسکے وجود کا کوئی ثبوت ہے تو پیش کیا جانا چاہئے (۱۱)

۔

پاکستانیات　　ڈاکٹر محمد امین

سول سوسائٹی (یعنی دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں، تاجروں، صنعت کاروں، طلباء، وکلاء، پروفیسرز، ڈاکٹرز اور انجینئرز وغیرہ) کے دین دار افراد کے نام......ایک اہم پیغام

آیئے! اس معاشرے کو بدل دیں

سول سوسائٹی کا کردار

اگرچہ روایتی طور پر مسلم معاشرے میں دینی اور سیاسی قیادت کا کردار اہم تر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن عصر حاضر میں معاشرے کے جو اجزائے ترکیبی سامنے آئے ہیں (۱) ان میں سول سوسائٹی (۲) کے دیگر

طبقات کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔

خصوصاً الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے صحافیوں اور ادیبوں کا کردار رائے عامہ کی تشکیل اور عامۃ الناس کی ذہن وکردار سازی میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اسے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے ساتھ ریاست کا چوتھا ستون کہا جانے لگا ہے۔ اسی طرح تاجر اور صنعت کار اور ان کی اختیار کردہ معاشی پالیسیاں خصوصاً ان کی مال خرچ کرنے کی پالیسی بھی معاشرتی رویوں اور اداروں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ابھی ماضی قریب میں پاکستان میں وکلاء نے اعلیٰ عدلیہ کی بحالی کے لیے جو کامیاب اور منظم مہم چلائی وہ ہم سب کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ اسی طرح تحریک پاکستان میں اور بعد میں بھٹو صاحب کے زمانے میں بنگلہ دیش کی نامنظوری کے خلاف طلبہ نے جو کامیاب مہم چلائی اس سے بھی ہم واقف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے میں تبدیلی لانے میں اگرچہ سیاسی اور مذہبی قیادت کا کردار روایتی طور پر نمایاں حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے لیکن معاشرے پر اثر انداز ہونے میں اب سول سوسائٹی کے دیگر عناصر بھی فعال اور قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں جن میں دانشور، ادیب، صحافی، تاجر، صنعت کار، طلباء، وکلاء، پروفیسرز، ڈاکٹرز اور انجینئرز وغیرہ شامل ہیں۔ زیر بحث عنوان کے حوالے سے اس بات کا مطلب یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح میں اگرچہ روایتی طور پر دینی اور سیاسی قیادت کا کردار اہم ہے لیکن یہ دونوں قیادتیں بوجوہ اگر اپنا کام نہ کریں یا مؤثر انداز میں یہ ذمہ داری ادا نہ کرسکیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرد اور معاشرے کو شتر بے مہار چھوڑ دیا جائے بلکہ سول سوسائٹی کے باشعور اور تعلیم یافتہ ارکان کا فرض ہے کہ وہ یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ اسلام کے تصور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی رو سے یہ ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوشش کرے جس کی تفصیل یہ ہے:

اصلاح معاشرہ —ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری

سوسائٹی سٹرکچر سے قطع نظر ہم چونکہ مسلمان ہیں اور جس نظریہ حیات پہ ایمان ویقین رکھتے ہیں وہ ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہے اور ہر آدمی کو قبر میں اور یوم حشر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے لہٰذا اسلامی احکام پر عمل کرنا اور ان کے مطابق زندگی گزارنا ہر فرد کی شخصی ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ محض انفرادی زندگی گزاریں بلکہ انہیں یہ حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ ایک معاشرہ اور ریاست تشکیل دیں اور جب ایسا معاشرہ اور ریاست وجود میں آجائے تو اسے اپنے نظریہ حیات کے مطابق چلائیں اور اگر نہ چل رہی ہو تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں کیونکہ صالح اجتماعیت ضروری ہے اور وہ اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ فرد کو اسلام پر چلنے میں مدد دے اور اس کا ساتھ دے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرے اور ریاست کی قوت اگر فرد

کے ساتھ نہ ہو یا خدانخواستہ وہ اس کی مخالف ہو تو فرد کا اسلامی احکام پر پوری طرح عمل کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اس لیے مسلم ریاست اور معاشرہ اگر اپنی اسلامی ذمہ داریاں پوری طرح ادا نہ کر رہے ہوں تو پھر یہ ہر مسلمان کی ذاتی دینی ذمہ داری ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ ان کی اصلاح کی کوشش کرے اور انہیں اسلام پر قائم کرے اور رکھے کیونکہ اسی میں آخر کار اس کی اپنی ذاتی فلاح بھی ہے۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم اصلاح معاشرہ کو یہاں 'ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری' کہہ رہے ہیں جب کہ علماء اسلام نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو بالعموم فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہماری بات علماء کے موقف کے متعارض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں بار بار حکم دیا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو لوگوں کو دین سکھائیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں۔ یہاں حکم عامۃ المسلمین کو ہے نہ کہ کسی خاص طبقہ کو (اور نہ اسلامی معاشرے میں کوئی خاص 'طبقۂ علماء' ہوتا ہے جس کے لیے الگ احکام ہوتے ہوں)۔ اور ویسے بھی فقہاء کرام جب کسی کام کو فرض کفایہ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین میں سے کچھ لوگ اگر اس فرض کو اس طرح ادا کر دیں کہ شارع کا مقصد حاصل ہو جائے تو گویا سارے مسلمانوں پر جو فرض عائد ہوتا تھا وہ ادا ہو گیا۔ لیکن اگر کچھ لوگوں کے فرض ادا کرنے کے باوجود شارع کا مطلوب حاصل نہ ہو تو یہ فرض دیگر عامۃ الناس پر بدستور فرض رہے گا اور ہر فرد مسلم کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ وہ یہ فرض ادا کرنے اٹھ کھڑا ہو۔ اس حالت کو ہم 'ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری قرار دے رہے ہیں۔ اس کی بہترین مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان عالی شان ہے جو آپ نے عامۃ المسلمین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ 'بلغوا اعنی ولو آیۃ' (یعنی لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی ہو) سورہ توبہ میں اسے 'اہل علم' کا کام قرار دیا ہے۔ اس کی توجیہ ہمارے نزدیک وہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں کی ہے۔

پاکستان کے موجودہ حالات

یہ تو ایک تمہیدی اور اصولی گفتگو تھی لیکن اگر ہم پاکستان کے حالات پر ایک معروضی نظر ڈالیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہاں فرد مسائل ومشکلات کا شکار کیوں ہے اور معاشرہ روبہ زوال کیوں ہے؟ تو ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اس صورت حال کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں فرد بے حس اور بے عمل ہے۔ سیاسی قیادت، معاشرے اور ریاست کو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق چلانے میں ناکام ہو چکی ہے اور دینی قیادت بھی اس کا پیدا کردہ خلاء پورا نہیں کر سکی اور معاشرے اور ریاست کی اصلاح کرنے اور انہیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل بنانے میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکی لہٰذا اب اس خلاء کو پورا کرنے کی یہی صورت باقی بچی ہے کہ سول سوسائٹی کے مختلف طبقات کے دین دار اور تعمیری سوچ رکھنے والے عناصر آگے آئیں اور معاشرے کی قیادت کریں۔ ہمارے خیال میں اس موقف کو وضاحت سے

بیان کرنے کی ضرورت ہے جو یہ ہے:

سیاسی اور دینی قیادت کی ناکامی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے — گو تلخ سہی — کہ ہمارے سیاسی قائدین کی اکثریت (الّا ماشاء اللہ) نہ صرف آخرت کی فکر سے عاری اور دینی احکام پر عمل سے محروم ہے بلکہ اپنی اجتماعی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی غافل ہے۔ وہ نہ صرف مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی پیروی کرتی ہے اور دنیاوی مفاد واقتدار کے لیے اسلام اور مسلم دشمن ممالک (خصوصاً امریکہ ویورپ) کی مرضی پر چلتی ہے بلکہ ان کی گماشتہ اور ایجنٹ بن کر مسلمان عوام کو بھی ان کے الحادی راستے پر چلانا چاہتی ہے۔ وہ قوم کو مکہ اور مدینہ کی بجائے نیویارک اور واشنگٹن کی راہ پر لے جانے کے لے ریاست وحکومت کے سارے وسائل استعمال کر رہی ہے۔ یوں وہ تعمیر کی بجائے تخریب اور لوگوں کی مشکلات ومسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں پیدا کرنے اور بڑھانے میں لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتی ہے اور اقتدار کے لیے ملک توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ عوام کے پیسے لوٹ کر مغربی بنکوں میں جمع کرتی ہے اور اقتدار اور ڈالروں کے لیے ملک بیچنے اور اسے غلامی کے گڑھے میں دھکیلنے سے بھی باز نہیں آتی۔

سیاسی قیادت کی ناکامی کے بعد دینی قیادت کا فرض تھا کہ وہ اس کے پیدا کردہ خلاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتی لیکن بدقسمتی سے وہ بھی ریاست اور معاشرے کی اصلاح کرنے میں ناکام ہوگئی ہے۔ جن دینی عناصر نے سیاسی جدوجہد کی راہ اپنائی وہ مسلک کی بنیاد پر سیاسی جہد وجہد کرنے، آپس کے انتشار، اخلاقی ساکھ قائم نہ کر پانے، غیر مؤثر پالیسیاں اپنانے اور عوام کی سیاسی حمایت حاصل نہ کر سکنے کی بناء پر کامیاب نہیں ہوسکے اور جن عناصر نے تعلیم وتدریس اور دعوت واصلاح کا راستہ اختیار کیا وہ بھی غیر مؤثر رہے کیونکہ ان کی تعلیمی پالیسی بھی ناقص تھی (مسلک پرستی، عصری علوم سے عدم اعتناء، نصاب کی قدامت، جدید مسائل اور مغربی تہذیب سے صَرف نظر وغیرہ) اور دعوت واصلاح کی حکمت عملی بھی (دین کا ناقص تصور، عصری تقاضوں کا عدم لحاظ وغیرہ) نیز انہوں نے عوام کے مسائل اور مصائب و مشکلات دور کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ یوں سیاسی قیادت کی ناکامی سے معاشرے میں جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے پورا کرنے میں دینی قیادت بھی ناکام رہی۔ ان میں سے بہت سے لوگ اگرچہ اپنی سمجھ کے مطابق دین پر چلنے اور معاشرے کو دین پر چلانے کی سعی بھی کر رہے ہیں لیکن ان کی کوششیں تھوڑی بھی ہیں اور ناقص بھی اور مؤثر طریقے سے کام کرنے کے بہت سے پہلو اور طریقے ایسے ہیں جن کی طرف ان کی توجہ اور التفات نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا کام غیر مؤثر اور نتیجہ خیزی سے دور ہے اور معاشرہ مسلسل دین سے دور اور دنیاوی لحاظ سے ناکام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

سول سوسائٹی کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ اِن حالات میں کہ سیاسی قیادت اپنے فرائض کی ادائی میں ناکام رہی ہے اور دینی قیادت بھی اپنی ناقص پالیسیوں اور غیر مؤثر حکمت عملی کی وجہ سے کوئی نتیجہ خیز کام نہیں کرسکی تو آخر اس معاشرے کا والی وارث کون ہوگا؟ اس کو بچانے کی اور اس کی اصلاح و تعمیر کی کوشش کون کرے گا؟

جیسا کہ ہم نے اس تحریر کے شروع میں کئی مثالیں دے کر واضح کیا تھا کہ ہماری سول سوسائٹی کے عناصر میں، الحمدللہ، ابھی تک جان ہے اور ان میں ایسے قابل، محنتی اور دینی جذبہ و شعور رکھنے والے عناصر ابھی تک موجود ہیں جو غلط اور صحیح کا ادراک رکھتے ہیں اور دنیاوی حالات کی تفہیم اور انہیں صحیح رُخ پر چلانے کے حوالے سے بھی وہ سیاسی و دینی لوگوں سے کہیں آگے ہیں، وہ اگر اٹھیں اور قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیں تو ان شاءاللہ وہ حالات کو بدل سکتے ہیں۔

اگلا سوال جو منطقی طور پر ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے لوگ (یعنی دانشور، ادیب، صحافی، تاجر، صنعتکار، وکلاء، طلباء، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز وغیرہ) حالات کی کایا کیسے پلٹ سکتے ہیں؟ اور معاشرے کی صحیح رُخ میں تبدیلی کے لیے ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے اس بات کا تجزیہ کرلیا جائے کہ ناکامی اور بگاڑ کا سبب کیا ہے؟ کیونکہ جب تک ناکامی، بگاڑ اور فساد کے اسباب و مظاہر کو نہیں سمجھا جائے گا، ان کے صحیح اور مناسب حل تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔

بگاڑ کے اسباب

ہماری رائے میں سیاسی اور دینی عناصر کی ناکامی اور معاشرے کے فساد و بگاڑ کے قابو نہ آسکنے کے دو بڑے سبب ہیں: ایک ہماری منافقت اور اپنے نظریۂ حیات سے بے وفائی اور دوسرے مغرب کی الحادی اور اسلام و مسلم دشمن تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی۔ اب ان نکات کی کچھ تفصیل:

نظریۂ حیات سے بے وفائی: بگاڑ کا پہلا سبب

۱۔ ہم میں سے ہر فرد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن عملاً اپنی زندگی اسلامی اصولوں اور تعلیمات کے مطابق نہیں گزارتا۔ ایمان و عمل کا یہ تضاد اور منافقت ہمارے مسائل، مشکلات اور زوال کا بنیادی سبب ہے۔

۲۔ بعض اوقات ہمیں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ہم تو نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ شلوار قمیض پہنتے ہیں اور انہوں نے داڑھی بڑھائی ہوئی ہے اور بہت سی عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں۔ ہماری خوشی اور غم اور دوسری بہت سی معاشرتی رسمیں بھی اسلامی ہیں اور دینی اجتماعات میں بھی لاکھوں کا مجمع

ہوتا ہے تو ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ہم لوگ تو اچھے خاصے مسلمان ہیں اور ہمارا معاشرہ بھی اسلامی ہے۔ دراصل جو چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صحیح تعلیم و تربیت نہ ہونے کی وجہ سے پورے دین پر یکسوئی اور عمل سے محروم ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ ایسے صاحب کردار مسلمان پیدا ہی نہیں کر پا رہا جن کے نعرۂ تکبیر سے قیصر و کسریٰ کے محل لرز جایا کرتے تھے۔

۳۔ قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ اگر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جب فرد اپنے نظریۂ حیات سے ۔۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو۔۔ خالص اور مکمل وابستگی اختیار کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر وہ بنیادی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں حصول اسباب کے لیے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت، ایثار، تنظیم اور منصوبہ بندی، اطاعت امیر، پابندیٔ قانون ۔۔۔ وغیرہ۔ جب یہ خصوصیات کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ قوم دنیا میں ترقی کرنے لگتی ہے اور اگر کوئی اس سے بہتر نظریۂ حیات اور اس پر مقابلتاً زیادہ یکسوئی اور کمٹمنٹ سے کاربند قوم موجود نہ ہو تو وہ دوسروں پر غالب بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے جو افراد تیار کیے چونکہ ان کا نظریۂ حیات بھی منزّل من اللہ، فطری اور صحیح تھا اور وہ اس پر پوری یکسوئی اور کمٹمنٹ کے ساتھ عامل بھی تھے لہٰذا ان کے اندر وہ اوصاف پیدا ہو گئے جو دنیا میں حصول اسباب کے لیے ضروری ہیں چنانچہ وہ دنیا میں حصول اسباب کے حوالے سے بھی ساری قوموں سے آگے نکل گئے اور جب تک ان میں وہ اوصاف غالب رہے دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اِس وقت مسلم معاشرے/تہذیب/اقوام/ممالک کیوں خوار و زبوں اور زوال پذیر ہیں؟ اس لیے کہ ان کے افراد کی اکثریت اپنے دین اور نظریۂ حیات پر یکسو اور اس سے کمٹڈ نہیں ہے چنانچہ ان کے اندر وہ اوصاف پیدا ہی نہیں ہو پا رہے جو اس دنیا میں ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

۴۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر مسلم معاشرے کے کچھ افراد دین کے کچھ حصے پر عمل کریں بھی تو اس کا کوئی مثبت اور انقلابی نتیجہ نکل سکتا کیونکہ گھڑی صرف اس وقت ٹھیک ٹائم دیتی ہے جب اس کے سارے پرزے ٹھیک کام کر رہے ہوں، چند پرزوں کے ٹھیک کام کرنے سے گھڑی صحیح وقت نہیں دے سکتی۔ اسی طرح چند فی صد لوگوں کے اچھا ہونے سے مسلم معاشرہ درست اور طاقتور نہیں ہو سکتا جب تک افراد معاشرہ کی اکثریت نہ بدلے اور اسلام کے مطابق عمل نہ کرے۔

اور یہ درستگی اور اطاعت صرف نماز روزے، داڑھی اور شلوار قمیض تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اور فرد کے ہر رویے میں ہونی چاہیے کہ اسلام نام ہی مکمل سپردگی اور بلا حدود و شرائط اطاعت کا ہے نہ کہ جزوی تابعداری اور ادھوری اطاعت کا۔

مغربی فکر و تہذیب کی پیروی: بگاڑ کا دوسرا بڑا سبب

۱۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ یہودی و نصاری تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں

دین سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ مسلم امت کا تجربہ اور مشاہدہ اس قرآنی حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ یورپ میں سأۃ ثانیہ کا آغاز مسلمانوں سے جذبۂ انتقام کی خاطر ہوا تھا جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے عیسائی ہیڈکوارٹر پر قبضہ کیا تو پادری سارے یورپ میں پھیل گئے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکائے، انہیں انتقام پر اکسایا اور مسلمانوں سے مقابلے اور ان کی تباہی کے لیے لوگوں کو ابھارا۔ یہی جذبہ تحریک سأۃ ثانیہ کی بنیاد بنا۔ اہل یورپ نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، ان کے درمیان پھوٹ ڈالی اور جب وہ کمزور ہوگئے تو انہیں طاقت سے کچل ڈالا، ان کے ملکوں پر قبضہ کیا، انہیں غلام بنایا، ان کے وسائل لوٹ لیے اور ان کے سارے اجتماعی ادارے توڑ اور گرا کر اپنے اصولوں اور اپنی تہذیب کے مطابق مسلم معاشرے کے سارے اداروں کی تعمیر نو کی۔ اس طرح انہوں نے صرف علاقے فتح نہیں کیے بلکہ لوگوں کے دل و دماغ بھی فتح کیے اور ان کو فکری اور ذہنی طور پر بھی غلام بنایا۔

جب آپس کی دو عظیم جنگوں کے بعد مغربی ممالک کمزور ہوگئے اور مسلمان ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوگئے تو اب استعمار نے چولا بدل لیا اور مسلمان ممالک کو اپنا ذہنی غلام، کمزور اور دست نگر رکھنے کے لیے نئی اور کامیاب منصوبہ بندی کی۔ اس کے لیے انہوں نے مسلم حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنایا، تعلیم، میڈیا اور ذہن سازی کے دوسرے پُر امن ذرائع استعمال کیے، معیشت کو امداد اور قرضوں میں جکڑا، علماء، سیاستدانوں اور مختلف طبقوں کو باہم لڑایا، فوجی آمریتوں کے ذریعے سیاسی عدم استحکام پیدا کیا — لیکن یورپ و امریکہ اور یہودیوں کی اس طرح کی ساری کوششوں اور سازشوں کے باوجود کچھ مسلم ممالک مضبوط ہوگئے۔ پاکستان نے ایٹم بم بنالیا، عراق نے مضبوط فوج کھڑی کرلی، ملائیشیا معاشی طور پر مستحکم ہوگیا، افغانستان نے ٹھیٹھ اسلامی نظام اپنالیا تو یہ سب مغرب سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے جھوٹے پروپیگنڈے اور سازشوں کی بنیاد پر پہلے عراق کو کچلا، پھر افغانستان کا تورابورا بنایا، لیبیا کو تباہ و برباد کیا اور اب پاکستان پر حملے اور شام و ایران پر دباؤ جاری ہے۔ یوں امریکہ و یورپ کی اسلام و مسلم دشمنی ایک واضح حقیقت ہے اور صرف ان کو نظر نہیں آتی جو آنکھوں کے اندھے ہیں یا چیزوں کو مغرب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔

۲۔ چونکہ پاکستان میں حکمران، بیوروکریسی، میڈیا، نظام تعلیم اور دوسرے شعبے مغربی اثرات اور دباؤ کے تحت مغربی فکر وتہذیب کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں لہٰذا مسلمان عوام بھی مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہوجاتے ہیں اور اس مغالطے اور غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ چونکہ مغرب کی تہذیب ترقی یافتہ، غالب اور بالادست ہے اور اس کی وجہ مغربی فکر اور اصولوں کی پیروی ہے لہٰذا اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مغربی فکر اور اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ بات اس لیے غلط ہے کہ مغربی تہذیب کے اصول ومبادی اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی سے نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ان

سے متضاد ہیں۔ اسلام کا عقیدہ اور ورلڈ ویو مغرب سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں توحید کا تصور ہے کہ اللہ خالق و مالک، رب، مطاع، رازق سب کچھ ہے اور انسان اس کا عبد ہے جس کا کام اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت ہے۔ یہ دنیا دار العمل ہے اور اس کے بعد ایک دوسری دنیا آئے گی جس میں دنیا میں اس کی جدوجہد کا نتیجہ نکلے گا اور یہ کہ آخرت دنیا سے اہم تر ہے اور یہ کہ انسان کی ہدایت کا انحصار اس وحی پر ہے جو اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے ذریعے انسانوں تک پہنچا تا ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپیر یسزم وغیرہ پر ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مختار مطلق ہے، وہ کسی کا عبد نہیں خصوصاً اجتماعی زندگی اور ریاست کے امور میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے اور آخرت کسی نے نہیں دیکھی۔ علم اور حقائق کا منبع انسانی عقل اور انسانی تجربہ و مشاہدہ ہے۔ ظاہر ہے مغربی تہذیب کے یہ اصول اسلامی تعلیمات کے خلاف اور ان سے متضاد ہیں لہٰذا اسلامی تہذیب کے ماننے والے مغربی تہذیب کے اصولوں کو نہیں مان سکتے اور نہ ان کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ اجتماع ضدین ہوگا جبکہ دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں اور ہو جائیں تو مثبت نتائج نہیں دے سکتیں۔

۳۔ مسلمان جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں یعنی **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں۔ یعنی جب تک دوسرے (جعلی) خداؤں کی نفی نہ کی جائے ایک سچے خدا کی عبادت واطاعت بے معنی ہے لہٰذا ایک مسلمان کے لیے دوسرے خداؤں کا انکار لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کو یکسو اور حنیف ہونا چاہیے، اسلام کی مکمل اطاعت کرنی چاہیے اور اسلام کے سوا جو کچھ بھی اس سے متضاد ہے اسے رد کر دینا چاہیے۔

۴۔ مغرب کی تہذیب صرف دنیا سنوارتی ہے جب کہ اسلام کی تہذیب دنیا اور آخرت دونوں سنوارتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اللہ و رسول کی مکمل اطاعت کریں۔ اگر وہ مغربی اصولوں کی پیروی کریں گے تو ان کی دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت بھی کیونکہ اس کے اصول اسلامی اصولوں کے برعکس اور متضاد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے دین دار عناصر کی قیادت اگر پاکستانی معاشرے کی اصلاح کرنا چاہے، اسے ترقی اور عروج سے ہم کنار کرنا چاہے، اس کے مسائل حل کرنا چاہے تو اس کے دو بنیادی اصول ہیں: ایک یہ کہ اسلامی تعلیمات پر عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے تناظر میں پوری طرح عمل کیا جائے اور دوسرے یہ کہ مغربی فکر و تہذیب کو رد کر دیا جائے۔

اب اس سے آگے بڑھیے اور یہ سوچیے کہ ان دو اصولوں کو کن اداروں کی شکل دی جائے جنہیں قائم کر کے آج کی سوسائٹی پر اثر انداز ہوا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ہم نے اس معاملے پر غور کیا ہے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کے لیے تین اصلاحی اقدامات کی ضرورت ہے اور تین ایسے اقدامات کی جن سے

معاشرے کے بنیادی مسائل ومشکلات کے حل کی صورت نکلنا شروع ہوجائے۔ان کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

اصلاحی اقدامات

۱۔ تعلیم وتربیت

تعلیم ہر فرد کی تعمیرِ شخصیت وکردار اور اس کی اصلاح اور اسی طرح معاشرے کی تعمیر واصلاح میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا اساسی کام یہ ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کرے جن کا طرزِ فکر وعمل معاشرے کے ان آئیڈیلز کے مطابق ہو، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اور اس کا نظام تعلیم ایسا فرد تیار نہیں کررہا اور یہی ہمارے معاشرے کی ایک بنیادی خامی اور اساسی کمزوری ہے جو اس کے عدم استحکام اور زوال کا سبب ہے لہٰذا ہمیں اس کمزوری کو رفع کرکے نظامِ تعلیم کی تشکیل نو اس طرح کرنا ہے کہ وہ یہ بنیادی کام احسن طریقے سے کرنے لگے۔ بلاشبہ تعلیم کی کثرت مطلوب ہے اور تعلیم عام کرنا ہم سب کا خواب ہے اور ہمیں اس کے لیے جدوجہد کرنا ہے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تعلیم کا قبلہ درست کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔اس اصلاح کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلامی اصولوں پر عصری ضروریات کی روشنی میں عمل کرتے ہوئے مغربیت یعنی تعلیم کی ویسٹرنائزیشن کو رد کردیا جائے۔ اس غرض سے جو کام اہمیت کے حامل ہیں وہ یہ ہیں کہ تعلیم سے ثنویت (dichotomy) یعنی دین ودنیا کی تفریق ختم کی جائے، (یعنی دینی مدارس میں جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کرایا جائے اور جدید تعلیم کے اداروں میں مذہبی تعلیم وتربیت کا مؤثر انتظام کیا جائے)۔طلبہ کی تعمیر سیرت وکردار اور تربیت کا اہتمام کیا جائے۔خواتین کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا جائے اور ان کے لیے الگ نصاب بنایا جائے —— معیارِ تعلیم بلند کیا جائے اور نصاب بازی، تربیت اساتذہ اور ہم نصابی سرگرمیوں کا کام اسلامی تناظر میں کیا جائے اور مغربیت (ویسٹرنائزیشن) اور اس کی اقدار کو رد کیا جائے جیسے تعلیم کی کمرشلائزیشن، مخلوط تعلیم، غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی نصابی کتب، غیرملکی امتحانات (او اور اے لیول)، انگریزی زبان کا غلبہ (انگلش میڈیم اور پہلی جماعت سے لازمی انگریزی وغیرہ) اور مغربی کلچر پر مبنی ہم نصابی سرگرمیاں (جیسے غیرملکی یونیفارم، مخلوط پکنک، ڈرامے، کنسرٹ وغیرہ)۔

یہ سارے کام کون کرے؟ جب حکومت کی اس طرف توجہ نہیں تو لامحالہ یہ کام پرائیویٹ سیکٹر اور سول سوسائٹی کو کرنا ہوں گے اور اس کے لیے ایسے موزوں نگران ادارے قائم کرنے ہوں گے جو موجودہ تعلیمی اداروں (سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس) کی نہ صرف مذکورہ تناظر میں اصلاح کریں بلکہ اصلاح یافتہ نئے تعلیمی ادارے قائم کریں۔ایسے نگران ادارے سول سوسائٹی کے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے افراد بھی قائم کرسکتے ہیں اور خود اصلاح کے خواہاں تعلیمی ادارے بھی باہم نیٹ ورکنگ کرکے ایسے

نگران ادارے قائم کر سکتے ہیں۔

۲۔میڈیا

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہمارے زمانے میں لوگوں کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے لیکن بدقسمتی سے تعلیم کی طرح اس کا قبلہ بھی درست نہیں ہے اور مغرب کی سازش اور پیروی سے لامحدود آزادی کا ایک ایسا غلط تصور ہمارے معاشرے میں آ گیا ہے جو اہل مغرب کے نزدیک تو صحیح ہے لیکن اسلامی روایت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اسلام کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے انسان اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت وعبادت کرے لہٰذا مسلم معاشرے میں آزادی اسلامی تعلیمات سے محدود ہوتی ہے لیکن ہمارا میڈیا مغرب سے مرعوب ومتاثر ہونے کی وجہ سے جو چاہتا ہے دکھاتا ہے اور جیسے پروگرام چاہتا ہے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ تفریح کے نام پر فحاشی وعریانی اور رقص وسرود پیش کیا جاتا ہے اور حالات حاضرہ کے نام پر پاکستان اور اس کے نظریے کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور رائے عامہ بھی غیر منظم اور بے حس ہے اور کوئی ردعمل نہیں دیتی اور نہ علماء کرام اور دینی جماعتیں حرکت میں آتی ہیں جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف یہ کہ سلبی طور پر کسی حکومتی یا پرائیویٹ چینل سے کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کیا جائے جو اسلامی اصول واقدار کے خلاف ہو یا پاکستان کے مفادات اور اس کے نظریے کے خلاف ہو بلکہ مثبت انداز میں ایسے پروگرام بھی تیار اور پیش کیے جانے چاہئیں جو معاشرے میں اسلامی اصول واقدار کو پروموٹ کریں اور لوگوں میں اسلامی زندگی گزارنے کا داعیہ پیدا کریں اور اس معاملے میں ان کی رہنمائی کریں اور ان کو ترغیب دیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے؟ ہم کہتے ہیں کہ سول سوسائٹی کے دین دار افراد کریں جن میں میڈیا میں کام کرنے والے اور میڈیا سے دلچسپی رکھنے والے افراد سرفہرست ہوں۔ حکومت سے ایک ثقافتی پالیسی بنوائی جائے۔ وہ نہ بنائے تو خود ایک ثقافتی پالیسی بنائی جائے اور اسے رواج دیا جائے۔ صحافیوں کی پیشہ وارانہ اور نظریاتی تربیت کے ادارے بنائے جائیں۔ میڈیا پر چیک رکھنے کے لیے نگران کمیٹیاں بنائی جائیں۔ غیر تعمیری اور غیر اسلامی پروگرام پیش کرنے والے میڈیا مالکان سے مل کر احتجاج کیا جائے اور ضرورت ہو تو ان کے خلاف ریلیاں اور جلوس نکالے جائیں اور ان کو عدالتوں میں گھسیٹا جائے۔ رائے عامہ کی قوت سے ایک پریس کورٹ بنائی اور چلائی جائے۔ تعمیری اور اسلامی پروگرام بنانے اور پیش کرنے کے لیے ادارے بنائے جائیں اور ایسے ٹی وی چینلز کھولنے کی کوشش کی جائے جو اسلام کو فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر اور عصری تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کو سلیقے اور حکمت سے پیش کریں۔

۳۔تعمیر اخلاق

قوموں کے عروج وزوال کا انحصار ان کی اخلاقی حالت پر ہوتا ہے۔ اخلاق بنتے اور بگڑتے ہیں نظام تعلیم وتربیت سے اور ذرائع ابلاغ سے۔ اسلام جس قسم کے اخلاق کی تعمیر چاہتا ہے ضروری ہے کہ ہم اس کے لیے موزوں نظام تعلیم وتربیت اور موزوں نظام ابلاغ وضع کریں۔ تعلیم اور میڈیا کے ذریعے یہ کام کیسے اور کس طرح ہوسکتا ہے اس کی کچھ تفصیلات ہم نے سطور سابقہ میں ذکر کی ہیں جن سے مقصود یہ تھا کہ تعلیمی اداروں اور میڈیا کو تعمیر اخلاق میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہاں ہم مزید یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سماجی اور معاشرتی سطح پر یعنی گھروں میں، خاندانوں میں اور گلی محلے اور کمیونٹی کی سطح پر بھی ہمیں تعمیر و اصلاح اخلاق کا کام کرنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ اولاً ہمارے تعلیمی ادارے ایسے ہونے چاہئیں اور ہمارا میڈیا ایسا ہونا چاہیے جو بچوں میں اسلامی اخلاق پیدا کرے اور ثانیاً ہمارا معاشرتی ماحول بھی ایسا ہونا چاہیے جو تعلیمی ادارے اور میڈیا کے اس مثبت کردار کا مؤید ہو، جو اسے پختہ تر کرے نہ کہ وہ اس کی مزاحمت کرنے والا اور اس کے اثرات زائل کرنے والا ہو، جیسا کہ بدقسمتی سے اِس وقت وہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ گلی محلے کے لوگ اس کے لیے ذہنی طور پر بیدار (conscious) ہوں تاکہ اپنی اخلاقی اقدار کی حفاظت کرسکیں مثلاً لڑکے بالے گلی کی نکڑ یا بازار کے کونے پر کھڑے ہوکر فضول ہنسی مذاق نہ کریں یا راہ چلتی خواتین کو تنگ نہ کریں۔ پارکوں میں بیٹھ کر سگریٹ نہ پئیں اور نشہ نہ کریں۔ محلے میں کوئی لائبریری قائم کردی جائے، کھیلوں کو منظم کردیا جائے۔ مختلف مواقع پر (مثلاً یوم پاکستان، یوم اقبال، استقبالِ رمضان وغیرہ) پر تقریبات منعقد کی جائیں۔ پڑھائی میں کمزور طلبہ کی مدد کی جائے۔ کسی بوڑھی اور معذور بیوہ کی مدد کی جائے۔ کسی مریض کو ہسپتال لے جایا جائے۔ کسی بے روزگار کو ملازمت دلوانے کی سعی کی جائے۔ مسجد یا کسی گھر میں ترجمۂ قرآن کی کلاس شروع کردی جائے۔ محلے والے کھاتے پیتے ہوں تو سکول قائم کرلیا جائے۔ ڈسپنسری کھول لی جائے۔ محلے میں نیٹ کیفے، سی ڈی شاپ یا ریسٹورنٹ کا غلط استعمال ہورہا ہوتو اسے روکا جائے۔ غرض خدمت خلق اور تعمیری مصروفیت کے سو کام نکالے جاسکتے ہیں۔

یہ تین کام جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ایسے ہیں جن سے معاشرے کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اصلاح کا یہ کام حکومت بھی کرسکتی ہے اور اصلاً اسے ہی کرنا چاہیے لیکن جب حکومت کو اس کا احساس نہیں (اور وہ خود اصلاح طلب ہے) اور ان کاموں کے بغیر معاشرے کی اصلاح اور تعمیر ممکن نہیں تو پھر رائے عامہ کو بیدار ہوکر یہ کام خود کرنے چاہئیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ سول سوسائٹی کے مختلف طبقات کے وہ افراد جنہیں اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اہمیت کا احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ متحد و متحرک ہوں اور تعلیم، میڈیا اور تعمیر اخلاق کے لیے منظم کوششوں کا آغاز کریں۔

مسائل ومشکلات کا حل بذریعہ خدمت خلق

لیکن جس معاشرے میں ہم زندہ ہیں، صرف اصلاحی کوششیں یہاں کارگر نہیں ہوسکتیں کیونکہ

حکمرانوں کی عدم توجہ سے معاشرہ مشکلات و مسائل کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لوگ دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کوئی ان کا پشتیبان نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کے دکھ درد کم کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جائیں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ دین مسلمانوں کے باہم ہمدردی اور خیر خواہی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی مدد، مسکینوں کی اعانت اور کمزوروں کی حمایت تمام عمر آپؐ کا اسوۂ حسنہ رہا اور صحابہ کرامؓ نے بھی آپؐ سے یہی سبق سیکھا اور وہ ہمیشہ مظلوموں اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات و افراد کی مدد کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ خدمت خلق جزو دین اور منشائے شریعت ہے بلکہ شریعت کا بنیادی مقصد ہی لوگوں کے مصالح کا تحفظ ہے اسی لیے ماہرین اصول فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کے پانچ بڑے مقاصد ہیں: حفظ دین، حفظ جان، حفظ نسل، حفظ عقل اور حفظ مال۔ شریعت کے احکام انہی پانچ مقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں اور ان کے بغیر شریعت کے مقاصد پورے نہیں ہوسکتے لہٰذا ان مقاصد کے لیے کام کرنا دین کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی نفاذِ شریعت ہے اور ان مقاصد کے لیے کام کرنا ہی ہر مسلم ریاست وحکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اور اگر حکومت یہ کام نہ کرے تو جتنے کام بغیر ریاستی قوت کے ہوسکتے ہوں وہ مسلم عوام کو منظم و مجتمع ہو کر کرنے چاہئیں اور شرعی لحاظ سے یہ قطعاً غلط اور ناقابل قبول ہے کہ اگر مسلم حکومت اِن مقاصد کے لیے کام نہ کرے تو علماء، خاندانوں اور اداروں کے سربراہ اور ذمہ داران بھی یہ کام نہ کریں بلکہ انہیں اِن مقاصد کے لیے ضرور جدوجہد کرنی چاہیے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سول سوسائٹی منظم ہو کر پرائیویٹ سیکٹر میں اِن مقاصد کے لیے منظم اور متحرک ہو کر محنت کرے تو شریعت بڑی حد تک نافذ ہوجائے گی اور کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔ لہٰذا جو لوگ دین اور شریعت کو صرف نماز روزے تک محدود رکھتے ہیں اور مقدرت ہوتے ہوئے ان مقاصد شرعیہ کے حصول کے لیے کام نہیں کرتے اور دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتے اور ان کے مسائل و مشکلات حل کرنے کے لیے کوششیں نہیں کرتے، ہماری رائے میں وہ غلط ہیں اور انہیں اپنے فہم دین کی اصلاح کرنی چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ دینی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ کمزور اور غریب و محتاج مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ خدمتِ خلق کے اس کام کے بیسوں شعبے ہوسکتے ہیں لیکن بطور نمونہ ہم نے ان میں سے تین کاموں کا انتخاب کیا ہے:

ا۔ مفلسی دور کرنے کے اقدامات

اِس مقصد کے لیے کئی طرح سے کام کیا جاسکتا ہے مثلاً ہر محلے/گاؤں کی سطح پر ایک کمیٹی بنالی جائے جو وہاں کے کھاتے پیتے گھروں سے کچھ معمولی رقم ماہانہ اکٹھی کرے اور محلے/بستی کے یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کو ہر ماہ مہیا کرے تاکہ کوئی مسلمان بھوکا نہ مرے اور اس کی بنیادی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔ یہ بات بظاہر معمولی لگتی ہے لیکن اگر یہ کام ہر محلے/بستی کی سطح تک منظم ہوجائے تو معاشرے

میں انقلاب برپا ہوجائے گا۔اسی طرح ملک میں ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل قائم کی جاسکتی ہے اور اگر اس کے چلانے والے ایسے لوگ ہوں جن پر قوم اعتماد کرتی ہو تو اس کونسل میں زکوٰۃ وصدقات کے کروڑوں روپے جمع ہوسکتے ہیں اور ایک نظم اور حکمت کے ساتھ ان سے معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ہر آبادی میں بلا معاوضہ کھانے کے تنور/ ہوٹل قائم کیے جاسکتے ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں سے کپڑے اکٹھے کرکے غریبوں تک پہنچانے کے سٹور قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح غریب بچوں کی فیسیں ادا کرنے کا انتظام کیا جاسکتا ہے، غریبوں کے علاج کے لیے فری ڈسپنسریاں قائم کی جاسکتی ہیں اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے کام کیے جاسکتے ہیں، ضرورت صرف احساس، جذبے اور تنظیم یعنی منظم ہونے کی ہے۔

۲۔ بحالیٔ امن وامان

ہمارے معاشرے میں لوگوں کا امن وسکون غارت ہوچکا ہے۔ روز چوریاں ہوتی اور ڈاکے پڑتے ہیں۔ اب تو سٹریٹ کرائمز بھی خاصے بڑھ گئے ہیں اور لفنگے وبدقماش نوجوان راہ چلتی خواتین کے پرس اور مردوں سے موبائل فون اور نقدی وغیرہ چھین لیتے ہیں۔ امن وامان کی بحالی حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن اگر حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا عوام کا یہی کام ہے کہ لٹتے رہیں اور بے بسی سے دیکھتے رہیں۔ اگر وہ منظم ہوجائیں تو موجودہ صورت حال پر خاطر خواہ حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہر گلی میں ایک 'امن کمیٹی' بنالی جائے اور گلی کے نوجوان رات کو باری باری جاگ کر پہرہ دیا کریں۔ اس سے کسی ایک فرد پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا اور چوریوں سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔

اس امن کمیٹی کے ارکان (بوڑھے اور جوان) اگر دن میں بھی آتے جاتے (خصوصاً نماز کے لیے مسجد میں آتے جاتے) اگر گلی میں آنے جانے والوں پر نظر رکھیں تو سٹریٹ کرائمز بھی ختم ہوجائیں گے اور چوروں اچکوں کو پتہ چل جائے گا کہ گلی محلے والے منظم ہیں تو وہ بھی ادھر آنے سے کترائیں گے۔

گلی والوں میں اتفاق ہوجائے تو وہ ماہانہ رقم اکٹھی کرکے گلی میں چوکیدار بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور چونکہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے اس لیے زیادہ پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔ دو چار سو روپے ماہانہ دینے سے امن وسکون کا جو احساس پیدا ہوگا اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ہمارے ہاں ابھی لوگوں کو اجتماعی سماجی کاموں کے لیے منظم ہونے کا تجربہ اور تربیت نہیں ہے۔ اگر گلی کا کوئی ایک سمجھ دار اور سنجیدہ آدمی اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر اس کے لیے متحرک ہوجائے اور ذرا صبر وحکمت سے کام لے تو لوگ آہستہ آہستہ سیکھنے لگیں گے اور ان کی بتدریج تربیت ہوتی رہے گی۔ تجربہ شرط ہے۔

۳۔ فراہمیٔ عدل وانصاف

ہمارے ملک کا نظام انصاف ناکارہ ہو چکا ہے خصوصاً نچلی عدالتوں میں رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہے اور انصاف کا پراسیس اتنا طول کھینچتا ہے خصوصاً دیوانی امور میں کہ آدمی کی عمر بیت جاتی ہے لیکن فیصلہ نہیں ہو پاتا اور ہو جائے تو مبنی بر انصاف اور اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہر عدالت میں مقدمات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ لوگوں کی باری نہیں آتی اور نہ جج کسی ایک مقدمے کو اتنا وقت دے سکتا ہے کہ مقدمات کا جلد فیصلہ ہونے لگے۔ حکومتی سطح پر اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اقدامات کیے جانے ناگزیر ہیں لیکن جب تک حکومت نظام انصاف کی اصلاح نہیں کرتی کیا مظلوم عوام اسی طرح پستے رہیں؟

ہمارے نزدیک اس کا ایک معقول حل ہے اور وہ یہ کہ ہر محلے اور بستی کی سطح پر شرعی/ مصالحتی عدالتیں قائم کی جائیں۔ چونکہ پاکستانی قوانین میں عدالت کے باہر مصالحت اور ثالثی کی گنجائش موجود ہے لہٰذا اگر سول سوسائٹی کے عدل پسند عناصر متحد و متحرک ہو جائیں تو ہر محلے و بستی کی سطح پر شرعی/ مصالحتی عدالتوں کا نیٹ ورک قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی اصولوں کی پاسداری کے لیے یہ اہتمام کیا جا سکتا ہے کہ اس مجوزہ تین رکنی عدالت کا سربراہ کوئی تعلیم یافتہ عالم دین ہو اور دیگر دو ارکان ریٹائرڈ جج، وکیل، پروفیسر/ استاد، ریٹائرڈ سرکاری ملازم یا علاقے کے معزز، متدین اور غیر جانبدار افراد میں سے ہو سکتے ہیں۔ مخصوص سیاسی مفادات کے علمبردار سیاستدانوں اور فرقہ وارانہ و متشدد رجحانات رکھنے والے علماء سے گریز کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پامال نہ ہوں۔

اس طرح کی مصالحتی عدالتیں جنہیں ہم نے اس حکمت کے تحت شرعی عدالتیں کہا ہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کرنے میں آسانی محسوس کریں۔ اگر ان میں فیصلے شریعت کے مطابق ہوں اور پورے پراسیس کو ایک نوع کا تقدس حاصل ہو جائے تو یہ عدالتیں بہت جلد ملک بھر میں پاپولر ہو جائیں گی اور لوگوں کو عدالتوں سے باہر شریعت کے مطابق انصاف ملنے کی امید بندھ جائے گی۔ وکیلوں اور عدالتوں کے اخراجات سے ان کی جان چھوٹے گی اور چونکہ یہ عدالتیں مقامی ہوں گی لہٰذا سفر کی مشقت اور اخراجات سے بھی جان چھوٹے گی اور فیصلے بھی جلد ہوں گے۔ قصبات اور شہروں میں ان عدالتوں کے اوپر ایک نگران یا اپیل کورٹ بھی قائم کی جا سکتی ہے۔

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ یہ اسکیم قابل عمل ہے۔ ضرورت صرف جذبے اور تنظیم کی ہے۔ اگر رائے عامہ بیدار ہو جائے اور سول سوسائٹی کے مختلف طبقات کے سربرآوردہ لوگ اس کے لیے منظم و متحرک ہو جائیں تو اس طرح کی عدالتوں کا ملک بھر میں جال پھیلایا جا سکتا ہے۔

حاصل بحث

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں سماجی تبدیلی کے لیے اسلامی تناظر میں اصلاح و خدمت کی ایک طاقتور تحریک اٹھنی چاہیے۔ یہ تحریک غیر سیاسی اور غیر مسلکی ہونی چاہیے تاکہ اس

میں ہرفردشریک ہوسکے۔عمر،تعلیم،جنس،معاشی یامعاشرتی حیثیت اور پیشے وغیرہ کی بھی کوئی تخصیص یاشرط نہیں ہونی چاہیے۔یہ ہمارامعاشرہ ہے،اس میں ہم نے رہناہےتوہمیں ہی اسے رہنے کے قابل بنانا ہے۔

ہم نے اس تحریر کی ابتداء میں سیاستدانوں اور دینی عناصر کی بحیثیت ایک طبقہ ناکامی کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگزنہیں ہے کہ ان میں اچھے لوگ نہیں ہیں یاانہیں اس تحریک میں شامل نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھا جائے تو سیاستدان اور علماء کرام ہمارے معاشرے اورسول سوسائٹی کا اہم حصہ ہیں لٰہذا انہیں تو اس تحریک میں ضرور شریک ہونا چاہیے اوراس کی قیادت بھی کرنی چاہیے۔بحیثیت طبقہ ان کی ناکامی کا ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ وہ بحیثیت طبقہ نتائج نہیں دے سکے لٰہذا سول سوسائٹی کوخود متحرک ہوکر معاشرے کے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے چاہئیں اورصرف ان پرانحصار نہیں کرنا چاہیے۔

آپ کیا کر سکتے ہیں؟

ہم نے اس تحریر میں سماجی تبدیلی کے لیے چھ بڑے دائرہ ہائے کار تجویز کیے ہیں جن میں کافی وسعت اورتنوع ہےاورآپ ان میں سے کسی ایک میں بھی کام کر سکتے ہیں۔اٹھیے! اوراللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیجیے! کم ازکم اس پیغام ہی کوآگے کسی اورتک پہنچادیجیے- کسی استفسار یا وضاحت کے لیے بلاتکلف ہم سے رابطہ کیجیے:

برائے رابطہ:

تحریک اصلاح تعلیم ۱ے-A فیصل ٹاؤن،لاہور
فون: 0300- 4609522
ای میل ermpak@hotmail.com
برائےSMS: 0300-4354673
ملاقات کے لیے وقت طے کر کے آیئے

تزکیہ نفس

احمد جاوید

تزکیۂ نفس میں نوافل کا کردار

س: وہ نفل کون سے ہیں جن پر رسول اللہؐ نے مداومت فرمائی یا جن کی ادائی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا؟

ج: اشراق، چاشت، پانچوں نمازوں سے جڑے ہوئے نوافل جنہیں ہمارے ہاں کی اصطلاح میں سنن مؤکدہ کہا جاتا ہے، تہجد (صلاۃ اللیل یعنی وہ نوافل جو رات کو سونے کے بعد اٹھ کر پڑھے جائیں)، تحیۃ المسجد (بشرطیکہ ان کے لئے وقت ہو)، تحیۃ الوضوٗ وغیرہ وہ نوافل ہیں جن پر آپؐ نے کم وبیش مداومت فرمائی۔ نماز اوابین یعنی مغرب کے بعد چھ یا بیس نوافل پڑھنا آپؐ کے معمول میں نہیں رہی لیکن آپؐ نے اسے پسند فرمایا۔ غرض نفل نماز کسی بھی طرح کی ہو آپؐ کے لئے پسندیدہ تھی۔

س: نفل کی ادائی کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

ج: ہم میں سے اکثر لوگ اس طریقے سے غافل یا ناواقف ہیں۔ آپؐ عام طور پر نفل میں تمام ارکان صلاۃ کو خوب طول دیا کرتے تھے خصوصاً لمبا قیام آپؐ کو بہت محبوب تھا۔ اس اسوۂ مبارکہ کی روشنی میں ہمیں بھی نفل میں زیادہ تلاوت، زیادہ تسبیحات اور زیادہ دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نماز کو جلدی جلدی بھگتا دینا بندگی کی اس روح کے خلاف ہے جو نوافل کی محرک بنتی ہے۔ یہ بات نفل کے معنی میں داخل ہے کہ بندہ کسی حکم کے بغیر محض اپنے ذوق وشوق کی وجہ سے اللہ کے آگے کھڑا ہوتا ہے۔ عجلت وغیرہ سے اس ذوق وشوق کی نفی ہوتی ہے۔ اس کی طرف سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔

س: آسان اور واضح کر کے بتایئے کہ نفل نماز کی ادائی کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

ج: یعنی آپ یہ پوچھ رہے ہیں کہ رسول اکرمؐ نفل نمازیں کس طرح پڑھا کرتے تھے؟ آپؐ کے آداب نوافل جاننے سے پہلے یہ سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ دین دراصل ذوق عبادت کا نام ہے۔ اگر یہ ذوق نہ ہو تو خیالات، جذبات اور اعمال کی کسی بھی قسم کو سچی دین داری کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ نوافل کی اصل اہمیت اور حیثیت جو رسول اللہؐ کے مزاج مبارک سے تمام وکمال ظاہر ہے، یہ ہے کہ ان سے ذوق عبودیت کی تسکین ہوتی ہے اور ان کی بدولت ذوق عبادت پیدا ہوتا ہے۔ گویا ذوق عبادت پہلے سے موجود ہوں تو اس کا سب سے بڑا اظہار کثرت نوافل سے ہوگا اور اگر پہلے سے موجود نہ ہوں یا کمزور ہوں تو اس کی پیدائش یا علاج کے لیے نوافل ہی کا سہارا لیا جائے گا۔ نبی کریمؐ کی حیات طیبہ دیکھ لیں، آپؐ کی ذاتی زندگی اور نجی معمولات میں مرکزیت نفل عبادات ہی کو حاصل تھی۔ صاف لگتا ہے کہ یہ عمل آپؐ کو محبوب ہی نہیں بلکہ محبوب ترین تھا۔ نوافل کی طرف اس رغبت اور محبت کی عملاً آرزو اور کوشش کیے بغیر ہم بندگی کے سب سے ضروری تقاضے کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ پورا کر سکتے ہیں اور وہ تقاضا ہے رسول اللہؐ کی ایسی اتباع جو ہماری پوری شخصیت کو محیط ہو، ہم اسی طرح محسوس کریں اور مزاج وطبیعت میں ویسے ہی بن جائیں۔

بہرحال رسول اکرمؐ نفل کی ادائی میں جن چیزوں کا اہتمام کرتے تھے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نماز کے ہر رکن کو طول دینا یعنی لمبا قیام، لمبے سجدے وغیرہ

۲۔ نماز کا آغاز اللہ کی مفصل ثنا سے کرنا — نماز میں ہم عام طور پر ایک ہی ثنا سے واقف ہیں۔ آپؐ سے ثنا اور دعاء کے کئی صیغے منقول ہیں۔ انہیں یاد کرنا چاہیے اور نمازوں میں پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

۳۔ قیام میں لمبی قرأت جس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ غضب کی آیات پر آپ ؐغضب سے پناہ مانگا کرتے تھے اور رحمت کی آیات پر اس کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ قرأت کے دوران میں ہوتا تھا۔ کاش ہم بھی قرآن کی کم از کم اتنی سمجھ پیدا کرلیں کہ ہم آیات کا فوری مفہوم جان سکیں۔ اس کے بغیر اس انتہائی قیمتی سنت پر عمل نہیں ہوسکتا۔

۴۔ رکوع بھی بہت لمبا ہوتا تھا۔ اس میں وہ تسبیح بھی کثرت سے پڑھتے تھے جو ہمارا معمول ہے یعنی سبحان ربی العظیم اور اس کے علاوہ دیگر تسبیحات بھی پڑھتے تھے۔ رکوع وسجود میں آپ ؐ دعائیں بھی کیا کرتے تھے، وہ دعائیں بھی اللہ کے فضل سے کتب احادیث میں محفوظ ہیں۔

۵۔ رکوع سے اٹھ کر قومے میں معروف تحمید یعنی **سمع اللہ لمن حمدہ** کے ساتھ آپ ؐ اور بھی بہت کچھ پڑھا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے قوما بعض اوقات رکوع جتنا ہی طویل ہوا کرتا تھا۔ قومے میں دعاء کا عمل آپ ؐ سے ہاتھ اٹھا کر بھی ثابت ہے اور ہاتھ اٹھائے بغیر بھی ثابت ہے۔

۶۔ سجدہ بھی رکوع ہی کی طرح فرمایا کرتے تھے۔ اس میں بھی وہی تفصیلات ہیں۔

۷۔ دوسجدوں کے بیچ کا وقفہ یعنی جلسہ بھی خاصا طویل ہوا کرتا تھا۔ اس میں بھی آپ ؐ مختلف دعائیں فرمایا کرتے تھے۔ جلسہ بھی اکثر اوقات سجدے جتنا طویل ہوا کرتا تھا۔

۸۔ آخری رکعت کے تشہد میں آپ ؐ دیر تک دعائیں مانگا کرتے تھے جس کی وجہ سے تشہد خاصا طویل ہوتا تھا۔ ہم اگر تشہد کو طویل کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں:

الف۔ التحیات کے تمام مسنون صیغوں کو یاد کر کے پڑھیں اور اسی طرح درود ابراہیمی کے مختلف مستند صیغوں کو بھی باری باری پڑھیں اور ان کے بعد کم از کم تین دعاؤں کو پڑھنے کا اہتمام رکھیں۔

ب۔ التحیات کے بعد درود پڑھ کر کم از کم دس مسنون دعاؤں کو تین تین مرتبہ ادا کریں اور اس کے بعد پھر تین مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیں اور سلام پھیر دیں۔

یہ دونوں طریقے ان شاء اللہ مسنون ہیں اور نوافل میں تشہد کو سنت کے مطابق طویل کرنے میں معاون بھی ہیں۔ ان پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔

۹۔ آپ ؐ نوافل کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ عموماً ساری دعائیں حالت نماز ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ ہمیں اس سنت کو بہت مضبوطی سے پکڑ لینا چاہیے۔

۱۰۔ آپ ؐ کا معمول تھا کہ تنہائی میں نماز شروع کرنے سے پہلے مصلے پر آنے تک اللہ کی حمد وثنا کرتے تھے اور مصلے پر آتے ہی نماز شروع نہیں کر دیتے تھے بلکہ کچھ دیر اللہ کی حمد اور بڑائی بیان کرنے میں گزارتے تھے۔ اس سے نماز کا پورا ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔

۱۱۔ گو کہ اس کا تعلق طرز ادائی سے نہیں ہے تاہم یہ جان لینا ہمارے لئے مفید ہوگا کہ آپ ؐ کے اکثر نفلی معمولات رات میں ہوا کرتے تھے اور اس کے لئے تنہائی کا اہتمام رکھا جاتا تھا۔ رات اور تنہائی سے نفلی

نماز کو خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

١٢۔ آپؐ جب دن کے وقت لوگوں کے سامنے نفل ادا فرماتے تھے تو وہ بہت مختصر ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ہمیں بھی ان نوافل کو مختصر رکھنا چاہئے جو ہم مجمع میں پڑھتے ہیں۔

س: رسول اللہؐ سے کچھ اقوال منقول ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حصول نجات کے لئے نوافل ضروری نہیں ہیں اور بعض دینی مصروفیات ایسی ہیں جو نوافل سے کہیں زیادہ اہم اور افضل ہیں۔ ان کی موجودگی میں نوافل کا اہتمام اول تو ہو نہیں سکتا اور دوسرے اس میں مشغول ہونا گویا کسی کم تر عمل میں مشغول ہونے کے برابر ہوگا۔ آپ جو نوافل پر اصرار کر رہے ہیں کیا اس طرح کی احادیث اس اصرار کو غلط تو نہیں بتا رہیں؟

ج: ہم نے جو نوافل کی اہمیت پر زور دیا ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کا نظام عبادات ناقص رہ جاتا ہے یا ان کو چھوڑ کر بندہ نجات کا مستحق نہیں رہتا --- نہیں! ہمارا مطلب کچھ اور ہے۔ نوافل کی ساری اہمیت تزکیے کے نقطۂ نظر سے ہے اسی لئے نفلی عبادات کی تاثیر معالجے جیسی ہے۔ ہمارے نفس کی جو حالت اب عام ہو گئی ہے اسے درست کرنے کی ہمارے خیال میں واحد تدبیر یہی ہے کہ اپنے اندر ذوق عبادت کو پروان چڑھایا جائے۔ اس بات سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ نوافل کی طرف راغب ہوئے بغیر عبادت کا ذوق حاصل نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے نفس کی موجودہ صورت حال میں نوافل ہی وہ ذرائع ہیں جنہیں اختیار کر کے شریعت کا مقصود اعظم ' ذوق عبادت ' حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اچھے وقتوں میں اس تاکید اور اصرار کی ضرورت نہ تھی کیونکہ لوگوں کو خشیت اور بندگی کی رغبت طبعاً میسر تھی اور ان کے معمولات زندگی اس خشیت اور رغبت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ایسے حضرات اگر کھیتی باڑی بھی کر رہے ہوں تو انہیں اللہ کا ایسا حضور حاصل ہوا کرتا تھا کہ جو کسی اچھے عبادت گزار کو نفل کے ذریعے سے میسر آتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ نفل عبادت قانونی ضرورت نہیں ہے بلکہ نفسیاتی ضرورت ہے۔ انسانی نفسیات صالح بنیادوں پر استوار نہ رہے تو اس کی تلقین ضروری ہو جاتی ہے۔

اب آیئے ان احادیث کی طرف جن سے نوافل کا ضروری نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اعرابی والی روایت کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ وہ صاحب سچائی کا مجسمہ تھے اور لگتا ہے کہ ان کے نفس میں اس کجی کا شائبہ تک نہ تھا جس کے ازالے کے لئے نوافل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے مقصود تو بس یہی ہے کہ آدمی پوری آمادگی، صداقت اور استقامت کے ساتھ اللہ کے بنائے ہوئے نظام الفرائض کی پابندی کرے اور اس کی راہ میں آنے والی ہر باطنی اور خارجی رکاوٹ کو عبور کر لینے کا پکا عزم رکھے۔ وہ صاحب، جیسا کہ حدیث کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے، ایسے ہی تھے۔ نیز وہ روایات جن سے عابد پر فقیہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اپنے سیاق وسباق میں نفل کی بے اہمیتی کی طرف اشارہ نہیں کر رہیں

بلکہ دین کے علم کو محض عمل سے بہتر کہہ رہی ہیں۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ وہ علم جو ضروری اعمال کے ساتھ ہو، اس عمل سے بہرحال افضل ہے جس کے پیچھے اعلیٰ درجے کا علم کارفرما نہ ہو۔ فقیہ پر واجب ہے کہ اپنے علم کو وسعت اور ترقی دیتا رہے اور کسی ایسے شغل میں نہ پڑے جو اس عمل کی رفتار کو روک دے یا کم کر دے۔ یہاں موازنہ واجب اور نفل کا ہوگا اور فقیہ کو عابد پر وہی ترجیح حاصل ہے، بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ حقیقی فقیہ وہ ہوتا ہے جس کی عبادت کا ذوق علمی اور دعوتی کاموں کی انجام دہی پر مائل کرتا ہے۔ اہلیت کے ساتھ دینی ذمہ داریوں کو عملاً انجام دینا یقیناً نفلی عبادات کے مقابلے میں بہت زیادہ ضروری ہے اور اس کا اجر بھی زیادہ ہے لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ آج خود علماء ان شاء اللہ فقیہ نہیں ہیں یا کم از کم وہ فقیہ نہیں ہیں جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ذوق عبادت بھی تقریباً نایاب ہو چکا ہے — اس صورت حال میں کہ فقیہ اور عابد دونوں درکار ہیں، تزکیہ و اصلاح کا آغاز ذوق عبادت کے حصول کی کوشش سے ہوگا اور دعوت و تعلیم کی طرف بعد میں دیکھا جائے گا کیونکہ سچا فقیہ بھی دراصل ذوق عبادت کی اساس پر فقیہ بنتا ہے۔ وہی ذوق عبادت جو بندے کو رہ رہ کر نوافل پر اُکساتا ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اسلاف کے سوانح سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان کا ذوق تفقہ اپنی ماہیت میں ذوق عبادت سے الگ کوئی چیز تھا۔ فی الحقیقت یہ ذوق عبادت ہی ہے جو نوافل سے پختگی حاصل کر کے ذوق تفقہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ائمہ دین انتہا درجے کے عبادت گزار تھے۔ مختصر یہ کہ اس مضمون کی احادیث کی مراد متعین کرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقیہ اور عابد آپس میں مخالف نہیں ہیں بلکہ ایک ہی نوع کے دو افراد ہیں۔ ایک کامل ہو چکا ہے اور دوسرے کو وہ کمال ابھی میسر نہیں ہے۔ فقیہ لازماً عابد بھی ہوگا جب کہ عابد فقیہ نہیں ہے۔ یہ جملہ ہی ان دونوں میں ترجیح کی بنیاد واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

مکاتیب

بزم قارئین

جسٹس (ر) نذیر احمد غازی

عمران خان پر آپ کا تجزیہ بہت عمدہ اور بروقت ہے۔ اس نے پنجاب اسمبلی کی قرارداد کے حوالے سے تعلیمی اداروں میں رقص وسرود کی جو حمایت کی تھی میں نے بھی اس پر نوائے وقت میں گرفت کی تھی۔ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو اس سے بہت سے اچھی توقعات وابستہ کر رہے ہیں۔ اس شمارے میں سیرت النبیؐ پر آپ کی تقریر بھی ایک اچھی کاوش ہے۔

مجیب الرحمن شامی

عمران خان کے حوالے سے آپ کا تبصرہ بے رحمانہ ہے۔ اگر آپ نے اس کی کتاب 'میں اور میرا پاکستان' پڑھی ہوتی تو شائد اتنا سخت تبصرہ نہ کرتے۔ اس کے ہاں جو فکری صراحت (Clarity of thought) ہے اور قرآن حکیم نے اس کی جو قلب ماہیت کی ہے وہ اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اگرچہ کھاتے پیتے گھرانے سے ہے لیکن اپنے حریفوں کی طرح حبّ سرمایہ داری میں مبتلا اور اس کے لیے ہر حد پھلانگنے والا نہیں ہے۔ البرہان کی آراء واسلوب کے مبنی پر اعتدال واستدلال ہونے کی ہماری توقع مجروح نہیں ہونی چاہیے۔

عطاء الحق قاسمی

آپ نے اہل تشیع کے ہاں سیرت النبیؐ پر جو تقریر کی مجھے وہ اچھی لگی تاہم جس طرح آپ نے وہاں سوالات اٹھائے ہیں، ایک سوال اٹھانے کی جسارت مَیں بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اہل تشیع اور اہل سنت میں صدیوں سے فاصلے موجود ہیں اور انہیں آپ پاٹنا چاہتے ہیں لیکن جاوید غامدی صاحب کو آپ گمراہ قرار دے کر دور کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ تضاد نہیں؟

البرہان

پرانی چوٹوں کا درد اگرچہ باقی رہتا ہے لیکن آدمی انہیں برداشت کرنے اور سہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ نئی چوٹ پر واویلا تو فطری ہے۔

تبصرہ کتب ایم ایس رفعت

اسلام اور جدید سائنس...... نئے تناظر میں

از محمد ظفر اقبال

یہ ایک نوجوان عالم کی تحریر ہے جسے بہت سی زبانوں اور علوم سے کما حقہٗ واقفیت حاصل ہے۔

مصنف نے سائنس کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اس پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اصل کتابوں کو براہِ راست پڑھا ہے اور مغربی دنیا کے اہم سائنس دانوں اور فلاسفہ کی ہی تحریروں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ 'سائنس' کوئی علم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'پاپر (Popper) اور اُس کے ناقدین لاکاتوش (Lakatos) ، مِلّر (Miller)، ٹخی (Tichy) اور گرُن بام (Grunbaum) کے تنقیدی افکار وخیالات کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ کوئی سائنسی نظریہ اغلاط سے مبرّ انہیں ہے، لہٰذا وہ علم جو اغلاط پر مبنی ہو اور جس کا سکہ صرف اور صرف مسلسل اغلاط دُور کر کے چلایا جاتا ہو، وہ علم کیسے کہلا سکتا ہے؟ علم ہو اور اُس میں اغلاط ہوں وہ علم کیسے ہو سکتا ہے؟'

فاضل مصنف نے یقینی طور پر درست گرفت کی ہے کہ سائنس ایسا کوئی علم نہیں ہے کہ جس کی پرستش کی جائے، شاید ہم نے بھی مغربی دنیا کی تقلید میں اس نئے بُت کی پرستش کرنی شروع کر دی ہے اور ہم اس حد تک چلے گئے ہیں کہ ہر وہ بات جس بات پر یقین وایمان بالغیب رکھنے کی تاکید بار بار کی گئی ہے، ہم اُن باتوں کے لیے بھی سائنسی توجیہات پیش کرنے لگے ہیں۔

ایک پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہے کہ نئی نسل چاہے وہ یورپ کی ہو یا ہمارے یہاں کی، وہ جس تعلیمی پس منظر سے آ رہی ہے اُسے سمجھانے کے لیے ایک مناسب حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ انہیں سائنسی علوم کے حوالے سے قرآن میں درج بہت سی باتوں کے درست ہونے کے متعلق بتایا جائے لیکن یہ بات یقینی طور پر درست نہیں کہ علوم عقلی کی دلیل کی بنا پر ہم علوم نقلی کو صحیح جانیں۔ درست منہج یہ ہے کہ ہم علوم عقلی کو علوم نقلی کی میزان پر رکھ کر دیکھیں کیونکہ بنیادی طور پر علوم عقلی اس کارزارِ حیات مین ہمیں مختلف سہولیات سے بہرہ مند تو ضرور کر سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

فاضل مصنف کی اس پُرخلوص کوشش کو سراہنے کے باوجود میں اُن کی خدمت میں کچھ گزارشات ضرور پیش کرنی چاہوں گا۔ ایک تو یہ کہ بہتر ہوگا کہ وہ شخصیات کے بارے میں کم از کم لکھیں (یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر نائیک کے حوالے سے لکھی گئی ہے) صرف اور صرف عہدِ حاضر میں جو نئے مسائل بلکہ فتنے اُٹھ رہے ہیں اُن کی جانب توجہ دیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ وہ ان دو باتوں کی طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کریں۔ دونوں باتیں محمد حسن عسکری مرحوم نے لکھی ہیں:

ا۔'مغربی مصنفین کو نئی اصطلاحات اختراع کرنے کا اِتنا شوق ہے کہ چاہے کوئی نئی بات کہی ہو یا نہ کہی ہو، مگر نئی اصطلاحات ضرور ہوں۔ یہ نئی اصطلاحات بھی دو قسم کی ہیں۔ ایک تو بھاری بھر کم اور پے چیدہ الفاظ ہیں جن کا بعض دفعہ کوئی مطلب نہیں ہوتا، مگر علمیت ضرور ٹپکتی ہے۔ لکھنے والوں کی تحریر میں ایسی اصطلاحات کی تعداد اِتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والا کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکتا اور اُس کا ذہن معطل ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو بظاہر خوش نما ہوتی ہیں اور براہ راست جذبات کو متاثر

کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دونوں قسم کی اصطلاحات کا مقصد اصل میں یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اپنے ذہن سے کام نہ لے سکے۔' (جدیدیت ص:۱۷)

۲۔ آج کل مغرب میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً اسناد اور حوالے پیش کرنے ہی کو 'علم' سمجھ لیا گیا ہے چنانچہ آج کل کتابوں میں حوالوں کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ بعض کتابیں تو اقتباسات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ حوالے درکار بھی ہیں یا نہیں اور اِن حوالوں کی قدر و قیمت کیا ہے۔ چنانچہ سند، حوالے اور شہادتیں پیش کرنا محض ایک بے معنی رسم بن کر رہ گیا ہے۔ (جدیدیت۔ص:۱۷)

لائق مصنف کی تحریر بہت جاندار ہے اور جدیدیت اور پس جدیدیت کی بنا پر جو نئے مسائل اُبھر رہے ہیں اُن پر تنقید کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جدیدیت اور سائنس کے نام پر آج مغربی دنیا اور اس کی تقلید میں باقی بیشتر اولادِ آدم کچھ نئے بتوں کی پوجا میں لگ گئی ہے جن میں سے ایک ہے 'دولت'۔ تمام سائنسی تجربات صرف اس لیے ہو رہے ہیں کہ کس طرح دنیا کی ساری دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے اور وہ جو بھی کہیں اُس پر باقی ساری اولادِ آدم آمنا وصدقنا کہے۔

کتاب ایک نئے ادارے 'نوادرات' نے شائع کی ہے۔ ۴۶۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۱۶۰ روپے بہت مناسب ہے۔ کراچی میں فضلی سپر بک مارکیٹ، اردو بازار سے اور لاہور میں 'کتاب سرائے' الحمد مارکیٹ سے دستیاب ہے۔